فہرست

اس شمارے میں

اس شمارے میں	نعیم احمد	۴

قرآنیات

البیان: ہود ۱۱: ۲۵-۹۹ (۲)	جاوید احمد غامدی	٦

معارف نبوی

مال کے ضائع کرنے اور دوہرا چہرہ رکھنے کے بارے میں	امین احسن اصلاحی	۳۱
مسلمانوں کی ایک حالت	معز امجد/ شاہد رضا	۳۴

مقالات

تعیین خطاب	امام حمید الدین فراہی	۳۷

سیر و سوانح

حضرت عمیر بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ	محمد وسیم اختر مفتی	۴۱

نقطۂ نظر

بعد از موت	رضوان اللہ	۴۵

ادبیات

آدمی کی نیکی باقی رہتی ہے	سراج الدین محمد بہادر شاہ ظفر	۵۰

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

نعیم احمد

''قرآنیات''میں حسب سابق جناب جاوید احمد غامدی صاحب کا ترجمۂ قرآن ''البیان'' شائع کیا گیا ہے۔ یہ قسط سورۂ ہود(۱۱) کی آیات ۲۵-۹۹ کے ترجمہ اور حواشی پر مشتمل ہے۔ ان آیات میں حضرت نوح، حضرت ہود، حضرت صالح، حضرت لوط، حضرت شعیب اور حضرت موسیٰ علیہم السلام اور ان کی قوموں کا ذکر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان تمام انبیا کو ان کی قوموں کی طرف اصلاح اور نجات کے لیے بھیجا، مگر کم لوگ ہی اللہ سے ڈرنے اور اس پر ایمان لانے والے نکلے۔ ایمان لانے والوں کو اللہ نے اپنی رحمت سے بچا لیا اور باقی سب کو ایک سخت عذاب سے دوچار کر دیا۔

''معارف نبوی''میں ''موطا امام مالک'' کی دو روایات کا انتخاب شاملِ اشاعت ہے۔ پہلی روایت میں اللہ تعالیٰ کی لوگوں کو نصیحت ہے کہ ایک اللہ کی عبادت کرو، کسی کو اس کا شریک نہ ٹھیراؤ اور اس کی رسی کو مضبوط تھامو، حکمرانوں کی اطاعت کرو، دھوکا دینے اور مال کو ضائع کرنے سے اپنے آپ کو بچائے رکھو۔ دوسری روایت میں ذکر ہے کہ آدمی کو ایسا صاف گو ہونا چاہیے کہ سننے والا بات کو بخوبی سمجھے کہ اس کا مقصد کیا ہے؟ اپنے معاملے میں کیا طریقہ اختیار کرے گا اور کوئی بات کہی جائے تو اس کا جواب کیا دے گا؟ ''معارف نبوی'' ہی کے تحت معز امجد صاحب کا مضمون ''مسلمانوں کی ایک حالت'' شامل اشاعت ہے۔ اس میں بیان ہوا ہے کہ جب تمھارے حکمران اچھے ہوں، تمھارے مال دار سخی ہوں اور تمھارے اجتماعی معاملات آپس میں مشورے سے حل ہوتے ہوں تو یہ زندگی تمھارے لیے بہتر ہے۔ اگر معاملہ اس کے برعکس ہو تو اس زندگی سے موت بہتر ہے۔

''مقالات'' کے تحت ''تعیین خطاب'' کے عنوان سے امام حمید الدین فراہی کے مضمون کا انتخاب کیا گیا ہے۔ اس میں انھوں نے قرآن کے حوالے سے اس بات کو واضح کیا ہے کہ قرآن، بے شک اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، مگر اس میں تمام خطاب اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے نہیں ہے، بلکہ اس میں کئی جگہوں پر خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے بھی ہے اور کچھ مقامات پر خطاب بندوں کی طرف سے بھی ہے، جیسے 'اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ' (ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں)۔

''سیر وسوانح'' کے تحت محمد وسیم اختر مفتی صاحب کے مضمون میں جلیل القدر صحابی حضرت عمیر بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے کم سنی میں ایمان لانے کے واقعے اور ان کے حالات زندگی کا ذکر ہے۔

''نقطۂ نظر'' میں رضوان اللہ صاحب نے اپنے مضمون ''بعد از موت'' میں زندگی، موت اور مرنے کے بعد دوبارہ زندگی کے تصور کو واضح کیا ہے۔

''ادبیات'' میں سراج الدین محمد بہادر شاہ ظفر کی نظم شائع کی گئی ہے۔ اس میں انھوں نے بتایا ہے کہ انسان کے مرنے کے بعد اس کے نیک اعمال اسے لوگوں کے دلوں میں زندہ رکھتے ہیں۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ ھود

(۲)

(گذشتہ سے پیوستہ)

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

وَلَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا نُوۡحًا اِلٰی قَوۡمِہٖۤ اِنِّیۡ لَکُمۡ نَذِیۡرٌ مُّبِیۡنٌ ﴿۲۵﴾ اَنۡ لَّا تَعۡبُدُوۡۤا اِلَّا
اللّٰہَ اِنِّیۡۤ اَخَافُ عَلَیۡکُمۡ عَذَابَ یَوۡمٍ اَلِیۡمٍ ﴿۲۶﴾ فَقَالَ الۡمَلَاُ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا مِنۡ

(اِسی طرح) نوح کو ہم نے اُس کی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجا تھا۔ (اُس نے اپنی قوم کے لوگوں سے کہا): میں تمھارے لیے ایک کھلا ہوا خبردار کرنے والا ہوں[149] کہ تم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو۔[150] (ایسا کرو گے تو) میں تم پر ایک دردناک دن کے عذاب کا اندیشہ رکھتا ہوں۔ اِس پر اُس کی قوم

۱۴۹؎ اصل میں 'نَذِیۡرٌ مُّبِیۡنٌ' کے الفاظ آئے ہیں، یعنی پوری قطعیت کے ساتھ اور صاف صاف خبردار کرنے والا۔ اِس میں ایک لطیف تلمیح بھی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...عرب میں دستور رہا ہے کہ ہر قوم کے لوگ کسی بلند ٹیلے یا پہاڑی پر دیدبان بناتے، جہاں ہر وقت ایک نگران مقرر رہتا جس کا کام یہ ہوتا کہ جب وہ دیکھتا کہ کسی طرف سے حملہ آوروں کی کوئی جماعت اُس کی قوم پر حملہ کیا چاہتی ہے تو وہ اپنے کپڑے پھاڑ کر ننگا ہو جاتا اور 'واصباحا' کا نعرہ لگاتا۔ یہ پوری قوم کے لیے الارم ہوتا اور سب تلواریں سونت سونت کر مدافعت کے لیے باہر نکل آتے۔ اِس کو 'نذیر عریاں' کہتے تھے۔ خدا کے رسول بھی اپنی قوم کو آنے والے عذاب سے آگاہ کرنے کے لیے آئے اور اُنھوں نے بالکل اِس طرح لوگوں کو اُس سے آگاہ کیا گویا

قَوۡمِهٖ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثۡلَنَا وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيۡنَ هُمۡ اَرَاذِلُنَا بَادِىَ الرَّاۡىِ وَمَا نَرٰى لَـكُمۡ عَلَيۡنَا مِنۡ فَضۡلٍۢ بَلۡ نَظُنُّكُمۡ كٰذِبِيۡنَ ﴿۲۷﴾

قَالَ يٰقَوۡمِ اَرَءَيۡتُمۡ اِنۡ كُنۡتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنۡ رَّبِّىۡ وَاٰتٰٮنِىۡ رَحۡمَةً مِّنۡ عِنۡدِهٖ فَعُمِّيَتۡ عَلَيۡكُمۡ ؕ اَنُلۡزِمُكُمُوۡهَا وَاَنۡتُمۡ لَهَا كٰرِهُوۡنَ ﴿۲۸﴾ وَيٰقَوۡمِ لَاۤ اَسۡـئَلُكُمۡ عَلَيۡهِ مَالًا

کے سرداروں نے جو منکر تھے، جواب دیا: ہم تو تمھیں اپنے جیسا ایک آدمی ہی دیکھتے ہیں اور ہمارے اندر جو اراذل ہیں، اُنھی کو دیکھتے ہیں کہ بے سمجھے بوجھے تمھارے پیچھے لگ گئے ہیں۔ ہم نہیں دیکھتے کہ ہمارے اوپر تمھیں کوئی بڑائی حاصل ہے، بلکہ ہم تو تمھیں بالکل جھوٹا سمجھ رہے ہیں[۱۵۱]۔ ۲۵-۲۷

نوح نے جواب دیا: میری قوم کے لوگو، ذرا سوچو اگر میں اپنے پروردگار کی طرف سے ایک روشن دلیل[۱۵۲] پر ہوں، پھر اُس نے مجھے خاص اپنی رحمت سے بھی نواز دیا[۱۵۳] اور وہ تمھیں نظر نہیں آئی تو کیا ہم (زبردستی) اُس کو تم پر چپکا دیں، جبکہ تم اُس سے بےزار ہو[۱۵۴]؟ میری قوم کے لوگو، میں اِس خدمت پر تم

وہ عقب سے نمودار ہی ہونے والا ہے۔ اِس وجہ سے قرآن میں اُن کے لیے 'نَذِيۡرٌ مُّبِيۡنٌ' کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔'' (تدبر قرآن ۴/ ۱۳۶)

۱۵۰؎ اِس سورہ کی آیت ۲ کو دیکھیے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنی دعوت کی ابتدا اِسی بات سے کی تھی۔

۱۵۱؎ یہ تین معارضات ہیں جو نوح علیہ السلام کی قوم کے سرداروں نے اُن کی دعوت کے جواب میں پیش کیے۔ آگے اِنھی کا جواب ہے۔

۱۵۲؎ اصل میں لفظ 'بَيِّنَة' آیا ہے۔ اِس سے مراد وہی نور فطرت ہے جس کا ذکر اِس سے پہلے آیت ۱۷ میں ہو چکا ہے۔

۱۵۳؎ یعنی اپنی وحی میری طرف نازل کر دی۔

۱۵۴؎ مطلب یہ ہے کہ تمھارے کرتوتوں کی وجہ سے فطرت کا چراغ بھی تمھارے اندر گل ہو چکا اور اِس کے نتیجے میں وحی کے ذریعے سے آنے والی ہدایت بھی تاریکیوں میں کھو گئی، پھر اپنے فساد طبیعت کے باعث تم اِس طرح کی چیزوں سے بےزار بھی ہو تو میں تمھارے اوپر ایک ایسی چیز کس طرح چپکا سکتا ہوں، جس کے چپکنے کے لیے

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ وَمَآ اَنَا بِطَارِدِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِنَّھُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّھِمْ وَلٰکِنِّیْٓ
اَرٰکُمْ قَوْمًا تَجْھَلُوْنَ ﴿۲۹﴾ وَیٰقَوْمِ مَنْ یَّنْصُرُنِیْ مِنَ اللّٰہِ اِنْ طَرَدْتُّھُمْ اَفَلَا تَذَکَّرُوْنَ ﴿۳۰﴾
وَلَآ اَقُوْلُ لَکُمْ عِنْدِیْ خَزَآئِنُ اللّٰہِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَیْبَ وَلَآ اَقُوْلُ اِنِّیْ مَلَکٌ وَّلَآ
اَقُوْلُ لِلَّذِیْنَ تَزْدَرِیْٓ اَعْیُنُکُمْ لَنْ یُّؤْتِیَھُمُ اللّٰہُ خَیْرًا اَللّٰہُ اَعْلَمُ بِمَا فِیْٓ اَنْفُسِھِمْ
اِنِّیْٓ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۳۱﴾ قَالُوْا یٰنُوْحُ قَدْ جٰدَلْتَنَا فَاَکْثَرْتَ جِدَالَنَا فَاْتِنَا بِمَا
تَعِدُنَآ اِنْ کُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِیْنَ ﴿۳۲﴾ قَالَ اِنَّمَا یَاْتِیْکُمْ بِہِ اللّٰہُ اِنْ شَآءَ وَمَآ اَنْتُمْ

سے کوئی مال نہیں مانگ رہا ہوں (کہ تمھاری ہر بات ماننے کے لیے مجبور ہو جاؤں)۔ میرا اجر تو اللہ کے ذمے ہے اور (تمھاری خوشنودی کے لیے) میں اُن لوگوں کو ہرگز نکال دینے والا نہیں ہوں جو ایمان لے آئے ہیں۔ وہ (اپنے اِسی ایمان کے ساتھ) اپنے پروردگار سے ملنے والے ہیں۔ (اُن کی قدر و قیمت کا فیصلہ وہی کرے گا)، مگر میں دیکھتا ہوں کہ تم لوگ جہالت میں مبتلا ہو۔ میری قوم کے لوگو، اگر میں اُن کو نکال دوں تو خدا سے بچانے کے لیے کون میری مدد کرے گا؟ پھر کیا سوچتے نہیں ہو۔ میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس خدا کے خزانے ہیں اور نہ میں غیب کا علم رکھتا ہوں، نہ یہ دعویٰ کرتا ہوں کہ میں کوئی فرشتہ ہوں[155] اور نہ اُن لوگوں کے بارے میں جنھیں تمھاری آنکھیں حقیر دیکھتی ہیں، (تمھاری طرح) یہ کہنے کی جسارت کر سکتا ہوں کہ اللہ اُنھیں کوئی بھلائی دے ہی نہیں سکتا۔[156] اُن کے دلوں میں جو کچھ ہے، اُسے اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ میں اگر ایسا کروں تو میں ہی ظالم ہوں گا۔ (اِس پر) اُن لوگوں نے کہا: اے نوح، تم نے ہم سے بحث کی ہے اور بہت کر لی ہے۔ اب اگر تم سچے ہو تو وہ چیز ہم پر لے آؤ جس کی تم ہمیں دھمکی سنا رہے ہو۔ نوح نے جواب دیا: وہ تو اللہ ہی تم پر لائے گا، اگر

تمھارے اندر سرے سے کوئی مادۂ قبولیت ہی باقی نہیں رہ گیا ہے۔

۱۵۵؎ یہ اُس بات کا جواب ہے جو مخاطبین نے کہی تھی کہ تم تو ہمیں اپنے جیسے ایک انسان ہی لگتے ہو، پھر تمھیں پیغمبر کس طرح مانیں؟

بِمُعۡجِزِيۡنَ ﴿۳۳﴾ وَلَا يَنۡفَعُكُمۡ نُصۡحِيۡۤ اِنۡ اَرَدۡتُّ اَنۡ اَنۡصَحَ لَكُمۡ اِنۡ كَانَ اللّٰهُ يُرِيۡدُ اَنۡ يُّغۡوِيَكُمۡ هُوَ رَبُّكُمۡ وَاِلَيۡهِ تُرۡجَعُوۡنَ ﴿۳۴﴾

اَمۡ يَقُوۡلُوۡنَ افۡتَرٰىهُ قُلۡ اِنِ افۡتَرَيۡتُهٗ فَعَلَىَّ اِجۡرَامِىۡ وَاَنَا بَرِىۡٓءٌ مِّمَّا تُجۡرِمُوۡنَ ﴿۳۵﴾

وَاُوۡحِىَ اِلٰى نُوۡحٍ اَنَّهٗ لَنۡ يُّؤۡمِنَ مِنۡ قَوۡمِكَ اِلَّا مَنۡ قَدۡ اٰمَنَ فَلَا تَبۡتَئِسۡ بِمَا كَانُوۡا يَفۡعَلُوۡنَ ﴿۳۶﴾ وَاصۡنَعِ الۡفُلۡكَ بِاَعۡيُنِنَا وَوَحۡيِنَا وَلَا تُخَاطِبۡنِىۡ فِى الَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡا اِنَّهُمۡ مُّغۡرَقُوۡنَ ﴿۳۷﴾ وَيَصۡنَعُ الۡفُلۡكَ وَكُلَّمَا مَرَّ عَلَيۡهِ مَلَاٌ مِّنۡ قَوۡمِهٖ سَخِرُوۡا مِنۡهُ

چاہے گا اور (اُس وقت) تم اُس کی گرفت سے نکل نہیں سکو گے۔ میں اگر تمھاری کچھ خیر خواہی کرنا بھی چاہوں تو میری خیر خواہی تمھیں کوئی فائدہ نہیں دے سکتی، اگر (تمھارے اِس رویے کے نتیجے میں) اللہ نے تم کو بھٹکا دینے کا ارادہ کر لیا ہے۔ وہی تمھارا پروردگار ہے اور تمھیں اُسی کی طرف پلٹنا ہے۔ ۲۸-۳۴

کیا یہ کہتے ہیں کہ (ہم پر چسپاں کرنے کے لیے) اِس شخص نے یہ قصہ خود گھڑ لیا ہے؟ اِن سے کہو (اے پیغمبر)، اگر میں نے یہ خود گھڑا ہے تو میرے جرم کا وبال میرے ہی اوپر ہے، لیکن (جانتے بوجھتے حقائق کو جھٹلا دینے کا) جو جرم تم کر رہے ہو، (اُس کی ذمہ داری تمھی پر ہے)، میں اُس سے بری ہوں[۱۵۷]۔ ۳۵

(پھر) نوح کو وحی کی گئی کہ تمھاری قوم کے لوگوں میں سے جو ایمان لا چکے، اب اُن کے سوا کوئی ایمان لانے والا نہیں ہے۔ سو اِن کے کرتوتوں پر غم کھانا چھوڑو اور ہماری نگرانی میں اور ہماری ہدایت کے مطابق کشتی بناؤ۔ اِن ظالموں کے حق میں مجھ سے کوئی بات نہ کرنا، یہ اب غرق ہو کر رہیں گے۔ نوح (اِس ہدایت کے مطابق) کشتی بنانے لگا اور اُس کی قوم کے سردار جب اُس کے پاس سے گزرتے تو

۱۵۶؎ وہ یہ بات اِس بنیاد پر کہتے تھے کہ جب خدا نے دنیا کی رفاہیت کے لیے اِن کا نہیں، بلکہ ہمارا انتخاب کیا ہے تو آخرت کی نعمتوں کے لیے یہ کس طرح منتخب کیے جا سکتے ہیں۔

۱۵۷؎ سورہ کی تلاوت کے دوران میں یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف التفات ہے جس میں سلسلۂ کلام کو روک کر

قَالَ اِنْ تَسْخَرُوْا مِنَّا فَاِنَّا نَسْخَرُ مِنْكُمْ كَمَا تَسْخَرُوْنَ ﴿٣٨﴾ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ
مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَيَحِلُّ عَلَيْهِ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ﴿٣٩﴾ حَتّٰٓى اِذَا جَآءَ اَمْرُنَا
وَفَارَ التَّنُّوْرُ قُلْنَا احْمِلْ فِيْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَاَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ

اُس کی ہنسی اڑاتے[158]۔ وہ اُنھیں جواب دیتا کہ اگر ہمارے اوپر ہنستے ہو تو جس طرح تم ہنستے ہو، اُسی طرح (ایک دن) ہم بھی تم پر ہنسیں گے[159]۔ پھر عنقریب جان لو گے کہ وہ کون ہیں جن پر وہ عذاب آتا ہے جو اُنھیں رسوا کر کے رکھ دیتا ہے اور وہ قہر نازل ہوتا ہے جو اُن پر (نازل ہو کر) ٹھیر جاتا ہے[160]۔ (وہ یہی کرتے رہے)، یہاں تک کہ جب ہمارا حکم آ پہنچا اور طوفان ابل پڑا[161] تو ہم نے کہا: ہر قسم کے جانوروں میں سے نر و مادہ، ایک ایک جوڑا کشتی میں رکھ لو[162] اور اپنے گھر والوں کو بھی (اِس کشتی میں سوار کرا لو)،

مخاطبین کے ردعمل پر برسر موقع تبصرہ کیا گیا ہے۔

۱۵۸؎ اِس لیے کہ عذاب کی دھمکی کو وہ سرے سے لاف زنی سمجھتے تھے۔ چنانچہ کشتی بننے لگی تو اُنھوں نے یہی خیال کیا ہو گا کہ یہ نوح اور اُس کے ساتھیوں کے خلل دماغ کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔

۱۵۹؎ یہ الفاظ مجانست کے اسلوب پر آئے ہیں اور اُس سرور و ابتہاج اور ازدیاد ایمان و اطمینان کی سرشاری کو بیان کرتے ہیں جو خدا کی نصرت کے ظہور پر اہل ایمان کو حاصل ہو گی۔ اِن کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہم بھی اُسی ابتذال پر اتر آئیں گے، جس پر تم اترے ہوئے ہو۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ''...کسی کی مصیبت پر خوش ہونا عام حالات میں تو اچھی بات نہیں ہے، لیکن جن لوگوں پر اُس طرح حجت تمام ہو چکی ہو، جس طرح حضرت نوح اور اُن کے ساتھیوں نے اپنی قوم پر تمام کی، اُن پر عذاب الٰہی کا نزول حق کی فتح مندی اور باطل کی ہزیمت کا ایک یادگار واقعہ ہوتا ہے جس پر اہل ایمان کا خوش ہونا عین مقتضاے ایمان ہوتا ہے۔'' (تدبر قرآن ۴/ ۱۴۱)

۱۶۰؎ رسولوں کی طرف سے اتمام حجت کے بعد جو عذاب آتا ہے، اُس کی نوعیت یہی ہوتی ہے۔ وہ آتا ہے تو اُسی وقت جاتا ہے، جب پوری قوم ایک داستان عبرت بن کر تاریخ کے عجائب خانوں کی نذر ہو جاتی ہے۔

۱۶۱؎ اصل میں 'فَارَ التَّنُّوْرُ' کے الفاظ آئے ہیں۔ یہ استعارے کے طور پر اُس طوفان کی تعبیر ہے جس میں تند

www.javedahmadghamidi.org www.al-mawrid.org

الْقَوْلُ وَمَنْ اٰمَنَ وَمَآ اٰمَنَ مَعَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلٌ ﴿۴۰﴾ وَقَالَ ارْكَبُوْا فِيْهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا اِنَّ رَبِّيْ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۴۱﴾

وَهِيَ تَجْرِيْ بِهِمْ فِيْ مَوْجٍ كَالْجِبَالِ وَنَادٰى نُوْحُ نِ ابْنَهٗ وَكَانَ فِيْ مَعْزِلٍ

سوائے اُن کے جن کے بارے میں حکم صادر ہو چکا ہے،[۱۶۳] اور اُن کو بھی جو ایمان لائے ہیں ـــــ اور تھوڑے ہی لوگ تھے جو اُس کے ساتھ ایمان لائے تھے۔[۱۶۴] نوح نے کہا: اِس میں سوار ہو جاؤ، اِس کا چلنا اور ٹھیرنا اللہ ہی کے نام سے ہے۔[۱۶۵] میرا پروردگار بخشنے والا ہے، اُس کی شفقت ابدی ہے۔[۱۶۶] ۳۶-۴۱

وہ کشتی پہاڑوں کی طرح اٹھتی ہوئی موجوں کے درمیان اُن کو لے کر چلنے لگی اور نوح نے اپنے بیٹے[۱۶۷]

سائیکلونی ہواؤں کے ساتھ بارش ہوئی اور پاس کے سمندر اور دریا بھی ابل پڑے۔

۱۶۲؎ آیت میں 'مِنْ كُلٍّ' کے الفاظ معہود ذہنی کے لحاظ سے استعمال ہوئے ہیں۔ یعنی اُن جانوروں کا ایک ایک جوڑا جو اُس وقت لوگوں کے تصرف میں تھے اور طوفان کے بعد کی زندگی کے لیے ضروری تھے۔

۱۶۳؎ یعنی جن کے بارے میں پہلے دن سے طے ہو چکا ہے کہ اپنے کرتوتوں کی وجہ سے دنیا میں بھی عذاب سے دوچار ہوں گے اور آگے بھی جہنم کا ایندھن بن جائیں گے۔

۱۶۴؎ یہ حسرت و افسوس کا جملہ ہے کہ لوگوں کی بڑی اکثریت نوح علیہ السلام کی طرف سے کئی سو سال تک دعوت و انذار کے باوجود حق سے گریزاں رہی اور بالآخر طوفان کی نذر ہو گئی۔ اِس میں بالواسطہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کے لیے تسلی کا پیغام بھی ہے کہ قریش کی مغرور اکثریت بھی اِنھی کے انجام کو پہنچتی ہے تو اِس پر تعجب نہ ہونا چاہیے۔ اِس سے پہلے بہت سی قومیں اِسی انجام کو پہنچ چکی ہیں۔

۱۶۵؎ یہ تفویض کا کلمہ ہے جس سے بندۂ مومن اسباب سے ماورا اپنے آپ کو مسبب الاسباب کے سپرد کر دیتا ہے۔

۱۶۶؎ اللہ تعالیٰ کی صفات کا یہ حوالہ انتہائی عجز کو ظاہر کرتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم اِس قابل تو نہیں تھے کہ ہم پر یہ عنایت کی جاتی، لیکن وہ گناہوں کو معاف کرنے والا اور نہایت مہربان ہے کہ نزول عذاب کی اِس گھڑی میں اُس نے ہمیں ہر تکلیف سے بچا لیا ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

يٰبُنَيَّ ارْكَبْ مَّعَنَا وَلَا تَكُنْ مَّعَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۴۲﴾ قَالَ سَاٰوِيْٓ اِلٰى جَبَلٍ يَّعْصِمُنِيْ
مِنَ الْمَآءِ قَالَ لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ وَحَالَ بَيْنَهُمَا الْمَوْجُ
فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِيْنَ ﴿۴۳﴾ وَقِيْلَ يٰٓاَرْضُ ابْلَعِيْ مَآءَكِ وَيٰسَمَآءُ اَقْلِعِيْ وَغِيْضَ
الْمَآءُ وَقُضِيَ الْاَمْرُ وَاسْتَوَتْ عَلَى الْجُوْدِيِّ وَقِيْلَ بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۴﴾

کو آواز دی، جو (کچھ فاصلے پر اُس سے) الگ تھا۔ بیٹا، ہمارے ساتھ سوار ہو جاؤ اور اِن منکروں کے ساتھ نہ رہو[۱۶۸]۔ اُس نے پلٹ کر جواب دیا: میں ابھی کسی پہاڑ کی پناہ لے لوں گا جو مجھے اِس پانی سے بچا لے گا[۱۶۹]۔ نوح نے کہا: آج اللہ کے حکم سے کوئی بچانے والا نہیں ہے، مگر جس پر وہ رحم فرمائے۔ (اتنے میں) ایک موج دونوں کے درمیان حائل ہوئی اور وہ بھی ڈوبنے والوں میں شامل ہو گیا[۱۷۰]۔ حکم ہوا: اے زمین، اپنا پانی نگل لے اور اے آسمان، تھم جا[۱۷۱]۔ چنانچہ پانی اتار دیا گیا، فیصلہ چکا دیا گیا، کشتی جودی[۱۷۲] پر

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

۱۶۷۔ تورات میں نوح علیہ السلام کے اِس بیٹے کا نام کنعان آیا ہے۔

۱۶۸۔ اِس جملے میں جذبۂ دعوت اور شفقت پدری، دونوں کی روح جس طرح سموئی ہوئی ہے، اُسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔

۱۶۹۔ اِس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ضد اور ہٹ دھرمی انسان کو کہاں تک لے جا سکتی ہے۔

۱۷۰۔ یہ بھی ممکن تھا کہ یہ منظر نوح علیہ السلام کو نہ دکھایا جاتا، لیکن اللہ تعالیٰ نے یہی چاہا کہ وہ یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ''...یہ حضرت نوح کی وفاداری کا آخری امتحان تھا جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرات انبیا کیسے کیسے امتحانوں سے گزارے جاتے ہیں، لیکن اللہ کی توفیق سے وہ ہر امتحان میں ثابت قدم رہتے ہیں۔ نیز اِس سے یہ حقیقت بھی واضح ہوتی ہے کہ خدا کا قانون جب اتنا بے لاگ ہے کہ نوح کا بیٹا بھی نافرمان ہو تو وہ اُس کی گردن بھی عین باپ کے سامنے دبا دیتا ہے تو تا بہ دیگراں چہ رسد۔'' (تدبر قرآن ۴/ ۱۴۴)

۱۷۱۔ یعنی اُدھر وہ ڈوبا اور اِدھر یہ حکم صادر ہو گیا۔ استاذ امام کے الفاظ میں یہ اِس ہول ناک ٹریجڈی کا آخری منظر تھا۔ اِس کے سامنے آ جانے کے بعد فوراً آسمان و زمین، سب کو احکام صادر ہو گئے کہ بس اب کام پورا ہو چکا!

وَنَادٰى نُوْحٌ رَّبَّهٗ فَقَالَ رَبِّ اِنَّ ابْنِیْ مِنْ اَهْلِیْ وَاِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ وَاَنْتَ اَحْكَمُ الْحٰكِمِیْنَ ﴿۴۵﴾ قَالَ یٰنُوْحُ اِنَّهٗ لَیْسَ مِنْ اَهْلِكَ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَیْرُ صَالِحٍ فَلَا تَسْئَلْنِ

ٹک گئی اور کہہ دیا گیا کہ اِس ظالم قوم پر خدا کی پھٹکار ہے۔ نوح نے اپنے رب کو پکارا اور کہا کہ پروردگار، میرا بیٹا تو میرے گھر والوں میں سے ہے[۱۷۳] اور اِس میں شبہ نہیں کہ تیرا وعدہ سچا ہے اور تو سب فیصلہ کرنے والوں سے بڑا فیصلہ کرنے والا ہے[۱۷۴]۔ فرمایا: اے نوح، وہ تیرے گھر والوں میں سے نہیں ہے[۱۷۵]، وہ

۱۷۲۔ یہ کوہستان اراراط کی ایک چوٹی کا نام ہے۔ آرمینیا کی سطح مرتفع سے شروع ہو کر یہ سلسلۂ کوہستان جنوب میں کردستان تک چلتا ہے۔ بائیبل میں اِسی بنا پر صرف اراراط کا نام آیا ہے۔ قرآن نے خاص اُس چوٹی کا ذکر، جہاں کشتی جا کر رکی تھی، اِس لیے کیا ہے کہ اِس سے طوفان کی ہول ناکی کا کچھ اندازہ کیا جا سکے کہ اُس میں پانی کہاں تک پہنچ گیا تھا۔

۱۷۳۔ اوپر بیان ہوا ہے کہ نوح علیہ السلام کو حکم دیا گیا تھا کہ اپنے اہل و عیال کو بھی کشتی میں سوار کرا لو۔ یہ بات اُنھوں نے اِسی بنا پر کہی ہے، اِس لیے کہ اُس وقت تک تعین کے ساتھ اُن کے علم میں نہیں تھا کہ اُن کا یہ بیٹا بھی خدا کے فیصلے کی زد میں آچکا ہے۔

۱۷۴۔ یہ دعا اُس وقت کی ہے، جب نوح علیہ السلام نے بیٹے کو ڈوبتے دیکھا، لیکن اِس کا ذکر یہاں ہوا ہے۔ اِس کی وجہ کیا ہے؟ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ''...خدا کی نگاہوں میں یہ شخص حضرت نوح کا بیٹا ہونے کے باوجود ایسا نابکار تھا کہ جب تک خدا نے اُس کو غرق نہیں کر لیا، اُس کے باب میں حضرت نوح کی دعا کو زیر بحث لانا بھی پسند نہیں فرمایا۔ اِس غضب کی وجہ ظاہر ہے کہ اِس دنیا میں اگر کسی انسان کو سب سے بڑی سعادت اور خوش بختی حاصل ہو سکتی ہے تو وہ یہی ہو سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اُس کو کسی پیغمبر کے گھر میں جنم دے، لیکن یہی خوش بختی سب سے بڑی بدبختی بھی ہو سکتی ہے، اگر وہ اِس کی قدر نہ کرے اور ولی کے گھر میں شیطان بن کر اٹھے۔ چنانچہ کلام کی ترتیب ہی سے یہ بات صاف عیاں ہے کہ اِس شخص کو خدا نے سب سے زیادہ مبغوض قرار دیا۔ گویا سارے طوفان کا اصلی ہدف تھا ہی یہی کہ جب یہ ڈوب گیا تو معاً طوفان کے خاتمے کا اعلان ہو گیا۔'' (تدبر قرآن ۴/ ۱۴۵)

۱۷۵۔ اِس کی وجہ یہ بیان فرمائی ہے کہ 'اِنَّهٗ عَمَلٌ غَیْرُ صَالِحٍ' (وہ نہایت نابکار ہے)۔ اِس سے واضح ہو گیا

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

مَا لَيۡسَ لَكَ بِهٖ عِلۡمٌ اِنِّیۡۤ اَعِظُكَ اَنۡ تَكُوۡنَ مِنَ الۡجٰهِلِيۡنَ ﴿۴۶﴾ قَالَ رَبِّ اِنِّیۡۤ اَعُوۡذُ بِكَ اَنۡ اَسۡـئَلَكَ مَا لَيۡسَ لِىۡ بِهٖ عِلۡمٌ وَاِلَّا تَغۡفِرۡ لِىۡ وَتَرۡحَمۡنِىۡۤ اَكُنۡ مِّنَ الۡخٰسِرِيۡنَ ﴿۴۷﴾ قِيۡلَ يٰنُوۡحُ اهۡبِطۡ بِسَلٰمٍ مِّنَّا وَبَرَكٰتٍ عَلَيۡكَ وَعَلٰٓى اُمَمٍ مِّمَّنۡ مَّعَكَ وَاُمَمٌ سَنُمَتِّعُهُمۡ ثُمَّ يَمَسُّهُمۡ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِيۡمٌ ﴿۴۸﴾

تِلۡكَ مِنۡ اَنۡۢبَآءِ الۡغَيۡبِ نُوۡحِيۡهَاۤ اِلَيۡكَ مَا كُنۡتَ تَعۡلَمُهَاۤ اَنۡتَ وَلَا قَوۡمُكَ مِنۡ قَبۡلِ هٰذَا فَاصۡبِرۡ اِنَّ الۡعَاقِبَةَ لِلۡمُتَّقِيۡنَ ﴿۴۹﴾

نہایت نابکار ہے۔ سو مجھ سے اُس چیز کے بارے میں سوال نہ کرو جس کا تجھے کچھ علم نہیں ہے۔ میں تجھے نصیحت کرتا ہوں کہ جذبات سے مغلوب ہو جانے والوں میں سے نہ بنو۔ نوح نے فوراً عرض کیا: پروردگار، میں تیری پناہ مانگتا ہوں کہ تجھ سے کوئی ایسی چیز مانگوں جس کا مجھے علم نہیں ہے۔ اور (جانتا ہوں کہ) اگر تو مجھے معاف نہ کرے گا اور مجھ پر رحم نہ فرمائے گا تو میں نامراد ہو جاؤں گا۔ ارشاد ہوا: اے نوح، اتر جاؤ، ہماری طرف سے سلامتی کے ساتھ اور برکتوں کے ساتھ، تم پر بھی اور اُن امتوں پر بھی جو اُن سے ظہور میں آئیں گی جو تمھارے ساتھ ہیں[۶۷ا]۔ اور (اِن کے بعد) کچھ ایسی امتیں بھی ہیں جنھیں ہم آگے بہرہ مند کریں گے، پھر (اُن کے جرائم کی پاداش میں) اُن کو بھی ہماری طرف سے ایک دردناک عذاب پکڑ لے گا[۷۷ا]۔ ۴۲-۴۸

یہ غیب کی خبریں ہیں جو (اے پیغمبر)، ہم تمھاری طرف وحی کر رہے ہیں۔ اِس سے پہلے نہ تم اِن کو جانتے تھے، نہ تمھاری قوم کے لوگ اِن سے واقف تھے۔ اِس لیے ثابت قدم رہو، انجام کار کی کامیابی

کہ پیغمبر کا گھرانا محض نسب سے نہیں بنتا، بلکہ ایمان اور عمل صالح سے بنتا ہے۔

۶۷ا اِس برکت اور سلامتی کا ظہور اِس طرح ہوا کہ بعد میں اِنھی چند نفوس کی اولاد تمام روے زمین پر چھا گئی۔

۷۷ا یعنی جو دینونت اِس وقت برپا ہوئی ہے، وہ بعد میں بھی وقتاً فوقتاً برپا ہوتی رہے گی اور جن لوگوں کو نجات ہوئی ہے، اُن کی اولاد میں سے جو ظالم ہوں گے، پیغمبروں کی طرف سے اتمام حجت کے بعد وہ بھی اِسی طرح

وَاِلٰی عَادٍ اَخَاھُمْ ھُوْدًا قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰہَ مَا لَکُمْ مِّنْ اِلٰہٍ غَیْرُہٗ اِنْ اَنْتُمْ
اِلَّا مُفْتَرُوْنَ ﴿۵۰﴾ یٰقَوْمِ لَآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ اَجْرًا اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَی الَّذِیْ فَطَرَنِیْ
اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۵۱﴾ وَیٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّکُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَیْہِ یُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَیْکُمْ

اُنھی کے لیے ہے جو خدا سے ڈرنے والے ہیں[۱۷۸]۔ ۴۹

(اِسی طرح) عاد کی طرف ہم نے اُن کے بھائی ہود کو بھیجا[۱۷۹]۔ اُس نے اُنھیں دعوت دی کہ میری قوم کے لوگو، اللہ کی بندگی کرو، اُس کے سوا تمھارا کوئی معبود نہیں ہے۔ (حقیقت یہ ہے کہ اُس کے مقابل میں) تم محض جھوٹ گھڑ رہے ہو۔ میری قوم کے لوگو، (میں یہ بات تمھاری خیر خواہی کے لیے کہتا ہوں)، میں اِس پر تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا۔ میرا اجر تو اُسی کے ذمے ہے جس نے مجھے پیدا کیا ہے۔ پھر کیا سمجھتے نہیں ہو؟ میری قوم کے لوگو، اپنے رب سے معافی مانگو، پھر اُس کی طرف پلٹو[۱۸۰]، وہ تم پر

کیفر کردار کو پہنچتے رہیں گے۔

۱۷۸؎ یہ اِس لیے فرمایا ہے کہ رسولوں سے متعلق سنت الٰہی یہی ہے کہ وہ اور اُن کے ساتھی کامیاب ہوتے اور اُن کے مخالفین لازماً نامراد ہو جاتے ہیں۔

۱۷۹؎ عاد عرب کی قدیم ترین قوم ہے۔ یہ سامی نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ اِن کا مسکن احقاف کا علاقہ تھا جو حجاز، یمن اور یمامہ کے درمیان الربع الخالی کے جنوب مغرب میں واقع ہے۔ عرب کے لٹریچر میں یہ اپنی قدامت کے لیے بھی ضرب المثل ہیں اور اپنی قوت وشوکت کے لیے بھی۔ حضرت ہود اِنھی کے ایک فرد تھے جنھیں رسول کی حیثیت سے اِن کی طرف مبعوث کیا گیا۔ قرآن نے امتنان واحسان کے لیے فرمایا ہے کہ عاد کی طرف ہم نے کسی اجنبی شخص کو نہیں، بلکہ اُنھی کے بھائی ہود کو بھیجا تاکہ اُن پر ہماری حجت ہر لحاظ سے پوری ہو جائے۔

۱۸۰؎ توبہ کے دو ارکان ہیں: ایک یہ کہ آدمی غلطی سے دست بردار ہو جائے اور دوسرا یہ کہ صحیح بات کی طرف پلٹ آئے۔ پہلے رکن کے لیے قرآن میں استغفار اور دوسرے کے لیے توبہ کا لفظ آتا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...اِن میں سے پہلے کی بنیاد خشیت پر ہے اور دوسرے کی محبت پر۔ پھر شعور و احساس اِن کا لازمی جزو ہے۔ جب تک یہ تمام عناصر جمع نہ ہوں، مجرد 'توبہ توبہ' یا 'استغفر اللہ' کے ورد سے وہ توبہ وجود میں نہیں آتی جو خدا کے ہاں

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

مِّدْرَارًا وَّيَزِدْكُمْ قُوَّةً اِلٰى قُوَّتِكُمْ وَلَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِيْنَ ﴿۵۲﴾ قَالُوْا يٰهُوْدُ مَا جِئْتَنَا
بِبَيِّنَةٍ وَّمَا نَحْنُ بِتَارِكِيْٓ اٰلِهَتِنَا عَنْ قَوْلِكَ وَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۵۳﴾ اِنْ
نَّقُوْلُ اِلَّا اعْتَرٰىكَ بَعْضُ اٰلِهَتِنَا بِسُوْٓءٍ قَالَ اِنِّيْٓ اُشْهِدُ اللّٰهَ وَاشْهَدُوْٓا اَنِّيْ بَرِيْٓءٌ
مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ﴿۵۴﴾ مِنْ دُوْنِهٖ فَكِيْدُوْنِيْ جَمِيْعًا ثُمَّ لَا تُنْظِرُوْنِ ﴿۵۵﴾ اِنِّيْ
تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ رَبِّيْ وَرَبِّكُمْ مَا مِنْ دَآبَّةٍ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌۢ بِنَاصِيَتِهَا اِنَّ رَبِّيْ

چھاجوں مینہ برسائے گا اور تمھاری قوت پر مزید قوت کا اضافہ کرے گا۔[۱۸۱] تم مجرم ہو کر روگردانی نہ کرو۔ اُنھوں نے جواب دیا: اے ہود، تم ہمارے پاس کوئی کھلی نشانی[۱۸۲] لے کر تو آئے نہیں ہو اور (اِدھر ہمارا فیصلہ یہ ہے کہ) محض تمھارے کہنے سے ہم اپنے معبودوں کو چھوڑنے والے نہیں ہیں اور نہ تم کو ماننے والے ہیں۔ ہم تو یہی کہیں گے کہ تمھارے اوپر ہمارے معبودوں میں سے کسی کی مار پڑی ہے۔ ہود نے کہا: میں خدا کو گواہ ٹھیراتا ہوں اور تم بھی گواہ رہو کہ جنھیں تم خدا کے سوا معبود بناتے ہو، میں اُن سے بالکل بری ہوں[۱۸۳]۔ سو تم سب مل کر، (جس طرح چاہو) میرے خلاف چالیں چلو، پھر مجھے ذرا مہلت نہ دو۔ میں نے اللہ پر بھروسا کر لیا ہے، اپنے اور تمھارے پروردگار پر۔ ہر جان دار کی چوٹی اُسی کے ہاتھ

قبولیت کا درجہ پائے۔'' (تدبر قرآن ۴/۱۴۸)

۱۸۱؎ یہ رسولوں کی دعوت پر اجتماعی توبہ کی برکتیں ہیں جو قرآن میں دوسرے مقامات پر بھی بیان ہوئی ہیں، یعنی رزق وفضل اور سیاسی قوت میں اضافہ جس کے لیے اللہ تعالیٰ آسمان کے دروازے کھول دیتے اور توبہ کرنے والوں کے لیے زمین پر اقتدار اور تمکن کے راستے ہموار کر دیتے ہیں۔

۱۸۲؎ یعنی کوئی ایسا حسی معجزہ جو فیصلہ کن ہو جائے۔

۱۸۳؎ اُن لوگوں کی بات چونکہ انتہائی بے ہودہ تھی، اِس لیے ہود علیہ السلام کی غیرت توحید بھڑک اٹھی ہے اور اُنھوں نے پورے جوش و جذبے کے ساتھ شرک سے براءت کا اعلان کر دیا ہے۔ پھر آگے دیکھیے تو اِسی بنا پر اُنھیں چیلنج بھی کر دیا ہے کہ تم اور تمھارے معبود میرے خلاف جو کر سکتے ہو، کر کے دیکھ لو۔ تمھیں معلوم ہو جائے گا کہ خدا پر سچا ایمان کیا ہوتا ہے اور میں کس کے بھروسے پر توحید کی یہ دعوت لے کر اٹھا ہوں۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ﴿۵۶﴾ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقَدْ اَبْلَغْتُکُمْ مَّآ اُرْسِلْتُ بِہٖٓ اِلَیْکُمْ
وَیَسْتَخْلِفُ رَبِّیْ قَوْمًا غَیْرَکُمْ وَلَا تَضُرُّوْنَہٗ شَیْئًا اِنَّ رَبِّیْ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ
حَفِیْظٌ ﴿۵۷﴾ وَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّیْنَا ہُوْدًا وَّالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَہٗ بِرَحْمَۃٍ مِّنَّا وَنَجَّیْنٰہُمْ
مِّنْ عَذَابٍ غَلِیْظٍ ﴿۵۸﴾

وَتِلْکَ عَادٌ جَحَدُوْا بِاٰیٰتِ رَبِّہِمْ وَعَصَوْا رُسُلَہٗ وَاتَّبَعُوْٓا اَمْرَ کُلِّ جَبَّارٍ عَنِیْدٍ ﴿۵۹﴾
وَاُتْبِعُوْا فِیْ ہٰذِہِ الدُّنْیَا لَعْنَۃً وَّیَوْمَ الْقِیٰمَۃِ اَلَآ اِنَّ عَادًا کَفَرُوْا رَبَّہُمْ اَلَا بُعْدًا

میں ہے۔ میرا پروردگار یقیناً سیدھی راہ پر ہے[۱۸۴]۔ اِس پر بھی اعراض کر رہے ہو تو میں نے وہ پیغام تمھیں پہنچا دیا ہے جو مجھے دے کر تمھاری طرف بھیجا گیا ہے۔ اب میرا رب تمھاری جگہ کسی دوسری قوم کو اقتدار کا مالک بنائے گا اور تم اُس کا کچھ بگاڑ نہ سکو گے[۱۸۵]۔ یقیناً میرا رب ہر چیز پر نگہبان ہے۔ (پھر ہوا یہ کہ) جب ہمارا فیصلہ صادر ہو گیا تو ہم نے ہود کو اور اُن لوگوں کو جو اُس کے ساتھ ایمان لائے تھے، اپنی رحمت سے نجات دی اور (اِس طرح) ایک نہایت سخت عذاب سے اُنھیں بچا لیا[۱۸۶]۔ ۵۰-۵۸

یہ تھے عاد، اِنھوں نے اپنے پروردگار کی آیتوں کا انکار کیا، اُس کے رسولوں کی بات نہیں مانی[۱۸۷] اور ہر جبار اور سرکش کے معاملے کی پیروی کرتے رہے۔ (آخر کار) اِس دنیا میں بھی اِن کے پیچھے لعنت لگا

۱۸۴؎ یعنی اُس کی معرفت کے لیے کج پیچ کے راستوں سے گزرنے اور اُس کی بارگاہ تک رسائی کے لیے واسطے اور وسیلے تلاش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ عقل و فطرت اُسے براہ راست پہچانتی ہے اور آدمی دل کی سچائی کے ساتھ اُس کی طرف متوجہ ہو جائے تو وہ بالکل سیدھی راہ پر اُس کے سامنے موجود ہوتا ہے۔

۱۸۵؎ مطلب یہ ہے کہ اب عذاب استیصال آئے گا، تمھاری جڑ کاٹ دی جائے گی اور کوئی دوسری قوم تمھاری جگہ لینے کے لیے اٹھے گی۔ اپنی تمام قوت و شوکت کے باوجود تم خدا کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں کر سکو گے۔

۱۸۶؎ یہ عذاب کس طرح نازل ہوا؟ قرآن میں اِس کی تفصیلات سے معلوم ہوتا ہے کہ سرما کے بادل رعد و برق کے ساتھ نمودار ہوئے اور باد صرصر آندھی اور طوفان بن کر پوری بستی پر ٹوٹ پڑی، یہاں تک کہ ہر چیز فنا ہو گئی۔

۱۸۷؎ اُن کی طرف اگرچہ ایک ہی رسول کی بعثت ہوئی تھی، مگر کوئی رسول بھی یہ دعوت اُن کے سامنے پیش کرتا،

لِّعَادٍ قَوۡمِ هُوۡدٍ ﴿۶۰﴾

وَاِلٰی ثَمُوۡدَ اَخَاهُمۡ صٰلِحًا قَالَ یٰقَوۡمِ اعۡبُدُوا اللّٰهَ مَا لَکُمۡ مِّنۡ اِلٰهٍ غَیۡرُهٗ هُوَ
اَنۡشَاَکُمۡ مِّنَ الۡاَرۡضِ وَاسۡتَعۡمَرَکُمۡ فِیۡهَا فَاسۡتَغۡفِرُوۡهُ ثُمَّ تُوۡبُوۡۤا اِلَیۡهِ اِنَّ رَبِّیۡ
قَرِیۡبٌ مُّجِیۡبٌ ﴿۶۱﴾ قَالُوۡا یٰصٰلِحُ قَدۡ کُنۡتَ فِیۡنَا مَرۡجُوًّا قَبۡلَ هٰذَاۤ اَتَنۡهٰنَاۤ اَنۡ
نَّعۡبُدَ مَا یَعۡبُدُ اٰبَآؤُنَا وَاِنَّنَا لَفِیۡ شَکٍّ مِّمَّا تَدۡعُوۡنَاۤ اِلَیۡهِ مُرِیۡبٍ ﴿۶۲﴾ قَالَ یٰقَوۡمِ

دی گئی اور قیامت کے دن بھی۔ سن لو، عاد نے اپنے پروردگار سے کفر کیا، سن لو کہ عاد دھتکار دیے گئے، ہود کی قوم کے لوگ! ۵۹-۶۰

(اِسی طرح) ثمود[۱۸۸] کی طرف ہم نے اُن کے بھائی صالح کو رسول بنا کر بھیجا۔ اُس نے اُنھیں دعوت دی کہ میری قوم کے لوگو، اللہ کی بندگی کرو، اُس کے سوا تمھارا کوئی معبود نہیں ہے۔ اُسی نے تمھیں زمین سے پیدا کیا اور اُس میں آباد کیا ہے۔ اِس لیے اُس سے معافی چاہو، پھر اُس کی طرف رجوع کرو۔ میرا پروردگار قریب بھی ہے اور (اپنے بندوں کی دعائیں) قبول کرنے والا بھی۔ اُنھوں نے جواب دیا: اے صالح، اِس سے پہلے تو ہمارے اندر تم سے بڑی امیدیں کی جاتی تھیں۔ (لیکن تم اچھے نکلے)! کیا اب ہمیں اُن معبودوں کی پرستش سے روکنا چاہتے ہو[۱۸۹] جنھیں ہمارے باپ دادا پوجتے آئے ہیں؟ ہم تو اُس چیز کے باعث جس کی طرف تم ہمیں بلا رہے ہو[۱۹۰]، بڑے سخت شبہے میں ہیں جس نے خلجان میں

اُس کے ساتھ وہ یہی کرتے، اِس لیے ایک رسول کی نافرمانی کو تمام رسولوں کی نافرمانی قرار دیا ہے۔

۱۸۸؎ یہ عاد کے بقایا میں سے ہیں۔ اِسی بنا پر اِنھیں عاد ثانی کہا جاتا ہے۔ عرب کی قدیم اقوام میں سے یہ دوسری قوم ہے جس نے عاد کے بعد غیر معمولی شہرت حاصل کی۔ اِن کا مسکن شمال مغربی عرب کا وہ علاقہ ہے جسے الحجر کہا جاتا ہے۔ اِن کے اور عاد کے اوصاف قرآن میں بھی اور عرب کی روایات میں بھی تقریباً ایک ہی جیسے بیان ہوئے ہیں۔

۱۸۹؎ اصل الفاظ ہیں: 'اَتَنۡهٰنَاۤ اَنۡ نَّعۡبُدَ'۔ اِن میں 'عَنۡ' محذوف ہو گیا ہے، یعنی 'أَتَنۡهٰنَا عَنۡ أَنۡ نَّعۡبُدَ'۔

اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّىْ وَاٰتٰنِىْ مِنْهُ رَحْمَةً فَمَنْ يَّنْصُرُنِىْ مِنَ اللّٰهِ
اِنْ عَصَيْتُهٗ فَمَا تَزِيْدُوْنَنِىْ غَيْرَ تَخْسِيْرٍ ﴿۶۳﴾
وَيٰقَوْمِ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِىْٓ اَرْضِ اللّٰهِ وَلَا تَمَسُّوْهَا
بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ قَرِيْبٌ ﴿۶۴﴾ فَعَقَرُوْهَا فَقَالَ تَمَتَّعُوْا فِىْ دَارِكُمْ ثَلٰثَةَ
اَيَّامٍ ذٰلِكَ وَعْدٌ غَيْرُ مَكْذُوْبٍ ﴿۶۵﴾ فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا صٰلِحًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا

ڈال دیا ہے۔ اُس نے کہا: میری قوم کے لوگو، ذرا غور کرو، اگر میں اپنے پروردگار کی طرف سے ایک روشن دلیل پر ہوں اور اُس نے مجھے اپنی طرف سے (خاص اپنی) رحمت سے بھی نواز دیا ہے[191] تو مجھے خدا کی پکڑ سے کون بچائے گا، اگر میں اُس کی نافرمانی کروں۔ سو (جو کچھ تم چاہتے ہو[192]، اُس سے تو) تم میری بربادی ہی میں اضافہ کرو گے۔ ۶۱-۶۳

میری قوم کے لوگو، یہ اللہ کی اونٹنی ہے، تمھارے لیے نشانی کے طور پر، لہٰذا اِس کو چھوڑ دو کہ اللہ کی زمین میں چرتی پھرے اور کسی برے ارادے سے اِس کو ہاتھ نہ لگانا، ورنہ کچھ زیادہ دیر نہ گزرے گی کہ تم پر عذاب آ جائے گا[193]۔ پھر ہوا یہ کہ اُنھوں نے اُس کی کونچیں کاٹ دیں[194]۔ اِس پر صالح نے خبردار کر دیا

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

۱۹۰؎ یعنی تمام معبودوں کو چھوڑ کر ایک خدا کی پرستش جس سے ہر پیغمبر نے اپنی دعوت کی ابتدا کی ہے۔

۱۹۱؎ یہی الفاظ پیچھے نوح علیہ السلام کی سرگذشت میں بھی آئے ہیں۔ وہاں ہم نے اِن کی وضاحت کر دی ہے۔

۱۹۲؎ اشارہ ہے اُن توقعات کی طرف جو اُن کی قوم کے لوگ اُن سے رکھتے تھے کہ اُن سے باپ دادا کا نام روشن ہو گا اور اُن کے آبائی دین اور قومی روایات کی عزت بڑھے گی۔

۱۹۳؎ مطلب یہ ہے کہ خدا کے حکم پر میں نے اپنی اونٹنیوں میں سے ایک اونٹنی نامزد کر دی ہے۔ یہ خدا کی نذر ہے، چنانچہ اِس لحاظ سے اللہ کی اونٹنی ہے۔ تمھارے لیے یہ خدا کے عذاب کی نشانی ہے۔ اِس کو گزند پہنچاؤ گے تو سمجھ لو کہ امان کی دیوار گر گئی۔ اِس کے بعد قہر الٰہی کے سیلاب کو کوئی چیز تمھاری بستیوں میں داخل ہونے سے روک نہیں سکے گی۔

۱۹۴؎ اونٹنی کو مارنے کا جرم اگرچہ اُن کے ایک سرکش سردار نے کیا تھا، مگر قرآن نے اُسے پوری قوم کی طرف

مَعَهٗ بِرَحۡمَةٍ مِّنَّا وَمِنۡ خِزۡیِ یَوۡمِئِذٍ اِنَّ رَبَّکَ هُوَ الۡقَوِیُّ الۡعَزِیۡزُ ﴿۶۶﴾ وَاَخَذَ الَّذِیۡنَ
ظَلَمُوا الصَّیۡحَةُ فَاَصۡبَحُوۡا فِیۡ دِیَارِهِمۡ جٰثِمِیۡنَ ﴿۶۷﴾ کَاَنۡ لَّمۡ یَغۡنَوۡا فِیۡهَا اَلَاۤ
اِنَّ ثَمُوۡدَاۡ کَفَرُوۡا رَبَّهُمۡ اَلَا بُعۡدًا لِّثَمُوۡدَ ﴿۶۸﴾
وَلَقَدۡ جَآءَتۡ رُسُلُنَاۤ اِبۡرٰهِیۡمَ بِالۡبُشۡرٰی قَالُوۡا سَلٰمًا قَالَ سَلٰمٌ فَمَا لَبِثَ اَنۡ

کہ اب تین دن اپنی اِس بستی میں اور رہ بس لو۔ یہ دھمکی جھوٹی ہونے والی نہیں ہے۔[۱۹۵] چنانچہ جب ہمارا حکم صادر ہو گیا[۱۹۶] تو ہم نے خاص اپنی رحمت سے صالح کو اور اُن لوگوں کو جو اُس کے ساتھ ایمان لائے تھے، (اُس عذاب سے) نجات دی اور اُس دن کی رسوائی سے بچا لیا۔[۱۹۷] اِس میں شبہ نہیں کہ تیرا پروردگار ہی قوی اور زبردست ہے۔[۱۹۸] اور جن لوگوں نے ظلم کیا تھا، اُن کو بڑے زور کی کڑک نے آ لیا اور وہ اپنے گھروں میں اِس طرح اوندھے پڑے رہ گئے کہ گویا وہاں کبھی بسے ہی نہیں تھے۔ سن لو، ثمود نے اپنے پروردگار سے کفر کیا۔ سن لو کہ ثمود دھتکار دیے گئے! ۶۴-۶۸

(اور لوط کے معاملے میں یہ ہوا کہ پہلے) ہمارے فرشتے ابراہیم کے پاس خوش خبری لے کر پہنچے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

منسوب کیا ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ باقی متمردین بھی اُس پر راضی تھے۔

۱۹۵؎ یہ اونٹنی قوم کی سرکشی کو جانچنے کا ایک پیمانہ تھی۔ اِس کو مارنے سے واضح ہو گیا کہ یہ لوگ اب مزید مہلت کے مستحق نہیں رہے۔ چنانچہ صالح علیہ السلام نے اپنے پروردگار کے ایما سے اُنھیں یہ نوٹس دے دیا۔

۱۹۶؎ یعنی عذاب کا حکم صادر ہو گیا۔ اِس کے لیے اصل میں لفظ 'اَمر' آیا ہے۔ اِس میں بلاغت یہ ہے کہ جیسے ہی حکم صادر ہوا، اُس کے ساتھ ہی عذاب آ گیا۔ گویا عذاب اُسی ایک لفظ کے اندر چھپا ہوا تھا۔

۱۹۷؎ اِس جملے میں ایک جگہ فعل اور ایک جگہ اُس کا متعلق عربیت کے اسلوب پر محذوف ہے۔ ہم نے ترجمے میں اُنھیں کھول دیا ہے۔

۱۹۸؎ اِس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کے لیے تسلی ہے کہ مطمئن رہو، اُس کی یہی قوت و عزت قریش کے معاملے میں بھی ظاہر ہو گی اور بالآخر وہی غالب رہے گا۔

جَآءَ بِعِجْلٍ حَنِيْذٍ ﴿٦٩﴾ فَلَمَّا رَاٰۤ اَيْدِيَهُمْ لَا تَصِلُ اِلَيْهِ نَكِرَهُمْ وَاَوْجَسَ مِنْهُمْ
خِيْفَةً قَالُوْا لَا تَخَفْ اِنَّاۤ اُرْسِلْنَاۤ اِلٰى قَوْمِ لُوْطٍ ﴿٧٠﴾ وَامْرَاَتُهٗ قَآئِمَةٌ فَضَحِكَتْ
فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ وَمِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ يَعْقُوْبَ ﴿٧١﴾ قَالَتْ يٰوَيْلَتٰۤى ءَ اَلِدُ وَاَنَا
عَجُوْزٌ وَّهٰذَا بَعْلِىْ شَيْخًا اِنَّ هٰذَا لَشَىْءٌ عَجِيْبٌ ﴿٧٢﴾ قَالُوْۤا اَتَعْجَبِيْنَ مِنْ

کہا: سلامتی ہو۔ ابراہیم نے جواب دیا: تم پر بھی سلامتی ہو۔ پھر کچھ دیر نہ گزری کہ ابراہیم ایک بھنا ہوا بچھڑا (اُن کی ضیافت کے لیے) لے آیا[199]۔ لیکن جب دیکھا کہ اُن کے ہاتھ اُس کی طرف نہیں بڑھ رہے ہیں تو اُن سے اُپرایا اور دل میں اُن سے کچھ ڈرنے لگا[200]۔ اُنھوں نے کہا: ڈرو نہیں، ہم قوم لوط کی طرف بھیجے گئے ہیں۔ ابراہیم کی بیوی پاس ہی کھڑی تھی، سو (خوشی سے) ہنس پڑی[201]۔ پھر ہم نے اُس کو اسحاق کی اور اسحاق کے بعد یعقوب کی بشارت دی[202]۔ وہ بولی: ہاے شامت! کیا میں بچہ جنوں گی، جبکہ میں خود بھی بڑھیا ہوں اور یہ میرے شوہر بھی بوڑھے ہو چکے ہیں۔ یہ تو بڑی عجیب بات ہے[203]۔ فرشتوں

۱۹۹؎ اِس سے سیدنا ابراہیم کی فیاضی اور مہمان نوازی کا اندازہ ہوتا ہے کہ اُنھوں نے اپنے مہمانوں کے لیے فوراً گلے کا ایک بچھڑا ذبح کرا دیا۔ اُن کے سامنے، ظاہر ہے کہ اُس کا کچھ گوشت پیش کیا گیا ہوگا، مگر قرآن نے ابراہیم علیہ السلام کی شخصیت کے اِس پہلو کو نمایاں کرنے کے لیے گوشت کے بجاے بچھڑے کا ذکر کیا ہے۔

۲۰۰؎ ڈرنے کی وجہ غالباً یہ اندیشہ تھا کہ کھانا نہیں کھا رہے تو ہوسکتا ہے کہ فرشتے ہوں اور اگر فرشتے ہیں اور انسانی صورت میں آئے ہیں تو کہیں میری یا میرے گھر والوں کی کسی غلطی پر تنبیہ کے لیے تو نہیں آئے۔

۲۰۱؎ انسان اگر خوف کی حالت میں ہو اور خوف کا سبب اچانک دور ہو جائے تو اِس طرح کی ہنسی بعض اوقات بے اختیار آ جاتی ہے۔

۲۰۲؎ فرشتوں نے یہ خوش خبری خدا کی طرف سے دی تھی، اِس لیے فرمایا ہے کہ ہم نے خوش خبری دی۔ استاذ امام کے الفاظ میں اِس خوش خبری کے اندر عنایت خاص اور تکمیل مسرت کے جو گوناگوں پہلو ملحوظ ہیں، وہ محتاج بیان نہیں اور بیٹے کے ساتھ پوتے کی بشارت نے گویا یہ اطمینان بھی دلا دیا کہ بیٹا زندہ رہے گا، اچھی عمر پائے گا اور اُس کے صلب سے نام ور پوتا بھی پیدا ہوگا۔

اَمۡرِاللّٰهِ رَحۡمَتُ اللّٰهِ وَبَرَكٰتُهٗ عَلَيۡكُمۡ اَهۡلَ الۡبَيۡتِ اِنَّهٗ حَمِيۡدٌ مَّجِيۡدٌ ﴿٧٣﴾
فَلَمَّا ذَهَبَ عَنۡ اِبۡرٰهِيۡمَ الرَّوۡعُ وَجَآءَتۡهُ الۡبُشۡرٰى يُجَادِلُنَا فِىۡ قَوۡمِ لُوۡطٍ ﴿٧٤﴾
اِنَّ اِبۡرٰهِيۡمَ لَحَلِيۡمٌ اَوَّاهٌ مُّنِيۡبٌ ﴿٧٥﴾ يٰۤـاِبۡرٰهِيۡمُ اَعۡرِضۡ عَنۡ هٰذَا اِنَّهٗ قَدۡ جَآءَ
اَمۡرُ رَبِّكَ وَاِنَّهُمۡ اٰتِيۡهِمۡ عَذَابٌ غَيۡرُ مَرۡدُوۡدٍ ﴿٧٦﴾

نے کہا: خدا کی بات پر تعجب کرتی ہو؟ ابراہیم کے گھر والو، تم پر تو اللہ کی رحمت اور اُس کی برکتیں ہیں[204]۔ یقیناً اللہ ستودہ صفات ہے، وہ بڑی شان والا ہے۔ ۶۹-۷۳

پھر جب ابراہیم کا خوف دور ہوا اور اُسے بشارت مل گئی تو وہ قوم لوط کے بارے میں ہم سے بحث کرنے لگا[205]۔ حقیقت یہ ہے کہ ابراہیم بڑا بردبار، بڑا دردمند اور اپنے پروردگار کی طرف بڑا دھیان رکھنے والا تھا۔ ابراہیم، یہ بحث چھوڑو، تمھارے پروردگار کا حکم ہو چکا ہے اور اب اِن لوگوں پر وہ عذاب آنے والا ہے جو لوٹایا نہیں جاتا[206]۔ ۷۴-۷۶

۲۰۳؎ یہ اظہار تعجب جن الفاظ میں ہوا، اُن کے پیچھے یہ خواہش صاف نظر آ رہی ہے کہ بشارت کے ظہور میں جو ظاہری رکاوٹیں ہیں، اُن کے بارے میں بھی اطمینان ہو جائے کہ اُن کے باوجود یہ بشارت پوری ہو جائے گی۔

۲۰۴؎ اصل الفاظ ہیں: 'رَحۡمَتُ اللّٰهِ وَبَرَكٰتُهٗ عَلَيۡكُمۡ اَهۡلَ الۡبَيۡتِ'۔ اِن میں 'عَلَيۡكُمۡ' کی ضمیر جمع مذکر ہے۔ عربی زبان میں گھر کی عورتوں کے لیے یہی شایستہ انداز خطاب ہے۔ اِس میں پردہ داری اور ادب و احترام کے جو تقاضے ملحوظ ہیں، اُن کا اندازہ ہر صاحب ذوق آسانی کے ساتھ کر سکتا ہے۔

۲۰۵؎ یہ بحث کیا تھی اور اپنے اندر ابراہیم علیہ السلام کی دردمندی، محبت، دل سوزی، غم خواری اور اپنے پروردگار سے ناز و اعتماد کے کیا کیا پہلو سمیٹے ہوئے تھی، اُنھیں دیکھنے کے لیے بائیبل میں اِس کی روداد پڑھنی چاہیے۔ پیدائش میں ہے:

"... پر ابراہام خداوند کے حضور کھڑا ہی رہا۔ تب ابراہام نے نزدیک جا کر کہا: کیا تو نیک کو بد کے ساتھ ہلاک کرے گا؟ شاید اُس شہر میں پچاس راست باز ہوں۔ کیا تو اُسے ہلاک کرے گا اور اُن پچاس راست بازوں کی خاطر جو اُس میں ہوں، اُس مقام کو نہ چھوڑے گا؟ ایسا کرنا تجھ سے بعید ہے کہ نیک کو بد کے ساتھ مار ڈالے اور نیک

وَلَمَّا جَآءَتۡ رُسُلُنَا لُوۡطًا سِیۡٓءَ بِهِمۡ وَضَاقَ بِهِمۡ ذَرۡعًا وَّقَالَ هٰذَا يَوۡمٌ عَصِيۡبٌ ﴿۷۷﴾
وَجَآءَهٗ قَوۡمُهٗ يُهۡرَعُوۡنَ اِلَيۡهِ وَمِنۡ قَبۡلُ كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ السَّيِّاٰتِ قَالَ يٰقَوۡمِ هٰٓؤُلَآءِ

(اِس کے بعد) جب ہمارے فرشتے لوط کے پاس پہنچے[۲۰۷] تو اُن کے آنے سے وہ بہت رنجیدہ اور دل تنگ ہوا اور کہنے لگا کہ یہ تو بڑی مصیبت کا دن ہے[۲۰۸]۔ اُس کی قوم کے لوگ (یہ دیکھ کر کہ خوب رو لڑکے آئے ہیں)، بے اختیار دوڑتے ہوئے اُس کے پاس آ پہنچے۔ پہلے سے وہ ایسی ہی بدکاریوں کے خوگر

بد کے برابر ہو جائیں۔ یہ تجھ سے بعید ہے۔ کیا تمام دنیا کا انصاف کرنے والا انصاف نہ کرے گا؟ اور خداوند نے فرمایا کہ اگر مجھے سدوم میں شہر کے اندر پچاس راست باز ملیں تو میں اُن کی خاطر اُس مقام کو چھوڑ دوں گا۔ تب ابراہام نے جواب دیا اور کہا کہ دیکھیے، میں نے خداوند سے بات کرنے کی جرأت کی، اگرچہ میں خاک اور راکھ ہوں۔ شاید پچاس راست بازوں میں پانچ کم ہوں۔ کیا اُن پانچ کی کمی کے سبب سے تو تمام شہر کو نیست کرے گا؟ اُس نے کہا: اگر مجھے وہاں پینتالیس ملیں تو میں اُسے نیست نہیں کروں گا۔ پھر اُس نے اُس سے کہا کہ شاید وہاں چالیس ملیں۔ تب اُس نے کہا کہ میں اُن چالیس کی خاطر بھی یہ نہیں کروں گا۔ پھر اُس نے کہا: خداوند ناراض نہ ہو تو میں کچھ اور عرض کروں۔ شاید وہاں تیس ملیں۔ اُس نے کہا: اگر مجھے وہاں تیس بھی ملیں تو بھی ایسا نہیں کروں گا۔ پھر اُس نے کہا، دیکھیے، میں نے خداوند سے بات کرنے کی جرأت کی۔ شاید وہاں بیس ملیں۔ اُس نے کہا: میں بیس کی خاطر بھی اُسے نیست نہیں کروں گا۔ تب اُس نے کہا: خداوند ناراض نہ ہوں تو میں ایک بار اور کچھ عرض کروں۔ شاید وہاں دس ملیں۔ اُس نے کہا: میں دس کی خاطر بھی اُسے نیست نہیں کروں گا۔'' (۱۸: ۲۲-۳۳)

۲۰۶؎ ہم پیچھے بیان کر چکے ہیں کہ رسولوں کی طرف سے اتمام حجت کے بعد جو عذاب آتا ہے، اُس کی نوعیت یہی ہوتی ہے۔ وہ جب ایک مرتبہ آ جاتا ہے تو اُسی وقت جاتا ہے، جب کچھ باقی نہیں رہتا۔

۲۰۷؎ حضرت لوط سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے بھتیجے تھے۔ اُن کی قوم اُس علاقے میں رہتی تھی جو شام کے جنوب میں عراق و فلسطین کے درمیان واقع ہے اور آج کل شرق اردن کہلاتا ہے۔ بائیبل میں اُن کے سب سے بڑے شہر کا نام سدوم بتایا گیا ہے۔ لوط علیہ السلام کا تعلق اُس قوم کے ساتھ وہی تھا جو حضرت موسیٰ کا قوم فرعون کے ساتھ تھا۔ قرآن کے دوسرے مقامات میں اُن کی بیوی کا ذکر جس اسلوب میں ہوا ہے، اُس سے اشارہ نکلتا ہے کہ اُن کی شادی اُسی قوم کے اندر ہوئی تھی اور اِس لحاظ سے وہ اُنھی کے ایک فرد بن چکے تھے۔

www.javedahmadghamidi.org www.al-mawrid.org

بَنَاتِیۡ ھُنَّ اَطۡھَرُ لَکُمۡ فَاتَّقُوا اللّٰہَ وَلَا تُخۡزُوۡنِ فِیۡ ضَیۡفِیۡ اَلَیۡسَ مِنۡکُمۡ رَجُلٌ
رَّشِیۡدٌ ﴿۷۸﴾ قَالُوۡا لَقَدۡ عَلِمۡتَ مَالَنَا فِیۡ بَنٰتِکَ مِنۡ حَقٍّ وَاِنَّکَ لَتَعۡلَمُ مَا نُرِیۡدُ ﴿۷۹﴾
قَالَ لَوۡ اَنَّ لِیۡ بِکُمۡ قُوَّۃً اَوۡ اٰوِیۡۤ اِلٰی رُکۡنٍ شَدِیۡدٍ ﴿۸۰﴾ قَالُوۡا یٰلُوۡطُ اِنَّا رُسُلُ

تھے۔ اُس نے کہا: میری قوم کے لوگو، یہ میری بیٹیاں ہیں۔ یہ تمھارے لیے زیادہ پاکیزہ ہیں۔ اِس لیے خدا کا خوف کرو اور میرے مہمانوں کے معاملے میں مجھے رسوا نہ کرو۔ کیا تم میں کوئی بھلا آدمی نہیں ہے؟[۲۰۹] اُنھوں نے جواب دیا: تمھیں معلوم ہی ہے کہ تمھاری بیٹیوں پر ہمارا کوئی حق نہیں ہے اور تم اچھی طرح جانتے ہو جو کچھ ہم چاہتے ہیں۔[۲۱۰] لوط نے کہا: اے کاش، میرے پاس تم سے مقابلے کی طاقت

۲۰۸؎ آگے کی آیتوں سے صاف مترشح ہوتا ہے کہ فرشتے نہایت خوب رو اور نوخیز لڑکوں کی صورت میں آئے تھے۔ حضرت لوط جانتے تھے کہ اُن کی قوم اِس معاملے میں کیسی بدکردار اور کتنی بے حیا ہو چکی ہے۔ یہی سبب تھا کہ اُن کو دیکھ کر وہ سخت پریشان ہو گئے۔

۲۰۹؎ لوط علیہ السلام کی طرف سے یہ اُن اوباشوں کے لیے کیا کوئی پیش کش تھی؟ استاذ امام لکھتے ہیں:

’’...یہ پیشکش نہیں، بلکہ اپنی قوم کے ضمیر کو جگانے اور جھنجھوڑنے کے لیے گویا حضرت لوط کی آخری بے تابانہ فریاد تھی کہ وہ سوچیں کہ ایک اللہ کا بندہ یہ ہے جو اپنے مہمانوں کی عزت کے معاملے میں اتنا حساس ہے کہ اُس کے لیے اپنی عزیز سے عزیز شے کو قربان کرنے پر تیار ہے اور ایک ہم ہیں کہ اندھے ہو کر اُس کے مہمانوں پر ٹوٹ پڑے ہیں۔ اِسی طرح اُنھوں نے اللہ کا خوف بھی یاد دلایا اور آخر میں ’اَلَیۡسَ مِنۡکُمۡ رَجُلٌ رَّشِیۡدٌ‘ کہہ کر گویا پوری طرح اُن پر حجت تمام کر دی۔ اِس لیے کہ کسی کے اندر رائی برابر بھی حق کی حمیت و حمایت کا احساس ہوتا تو اِس فقرے کے بعد تو اُس کو ضرور حرکت میں آ جانا تھا، لیکن جب اِس کے بعد بھی کوئی ضمیر بیدار نہیں ہوا تو اِس کے صاف معنی یہ ہیں کہ کسی کے اندر حس انسانیت و شرافت سرے سے باقی ہی نہیں رہ گئی تھی۔‘‘ (تدبر قرآن ۴/ ۱۵۸)

۲۱۰؎ مطلب یہ ہے کہ بات کو الجھانے کی کوشش نہ کرو۔ ہم یہاں تمھاری بیٹیوں کو بیاہ کر لے جانے کے لیے نہیں آئے اور تم جانتے ہو کہ اُس کے بغیر ہمارا کوئی حق اُن پر قائم نہیں ہوتا۔ اِس لیے جو کچھ ہم کرنا چاہتے ہیں، کرنے دو، اُس کی راہ میں رکاوٹ نہ بنو۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

رَبِّكَ لَنْ يَّصِلُوْٓا اِلَيْكَ فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّيْلِ وَلَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ اَحَدٌ
اِلَّا امْرَاَتَكَ اِنَّهٗ مُصِيْبُهَا مَآ اَصَابَهُمْ اِنَّ مَوْعِدَهُمُ الصُّبْحُ اَلَيْسَ الصُّبْحُ بِقَرِيْبٍ ﴿۸۱﴾
فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ
مَّنْضُوْدٍ ﴿۸۲﴾ مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ وَمَا هِيَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ بِبَعِيْدٍ ﴿۸۳﴾
وَاِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَالَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ وَلَا

ہوتی یا میں کسی مضبوط سہارے کی پناہ لے سکتا۔[۲۱۱] فرشتوں نے کہا: اے لوط، ہم تمھارے پروردگار کے بھیجے ہوئے ہیں۔ (مطمئن رہو)، یہ تمھارے قریب بھی نہیں آسکیں گے۔ سوا اپنے اہل وعیال کو لے کر کچھ رات رہے نکل جاؤ اور تم میں سے کوئی پیچھے پلٹ کر نہ دیکھے۔ تمھاری بیوی نہیں، اِس لیے کہ اُس پر وہی کچھ گزرنے والا ہے جو اِن لوگوں پر گزرنا ہے۔ اِن (پر عذاب) کے لیے صبح کا وقت مقرر ہے۔ (تم پریشان کیوں ہوتے ہو)؟ کیا صبح قریب نہیں ہے! ۷۷-۸۱

پھر جب ہمارا حکم آ پہنچا تو ہم نے اُس بستی کو تلپٹ کر کے رکھ دیا اور اُس پر پکی ہوئی مٹی کے پتھر برسائے، تہ بر تہ،[۲۱۲] جو تمھارے پروردگار کے ہاں نشان لگائے ہوئے تھے[۲۱۳] اور وہ اِن ظالموں سے کچھ زیادہ دور نہیں تھے۔[۲۱۴] ۸۲-۸۳

اور مدین[۲۱۵] کی طرف اُن کے بھائی شعیب کو رسول بنا کر بھیجا۔ اُس نے دعوت دی کہ میری قوم کے

۲۱۱؎ یہ انتہائی اضطراب، مایوسی اور بے بسی کا جملہ ہے جس نے گویا آخری حجت تمام کر دی۔ چنانچہ فرشتوں نے بھی اِس کے بعد حقیقت سے پردہ اٹھا دیا۔

۲۱۲؎ پیغمبروں کی طرف سے اتمام حجت کے بعد اُن کی قومیں بالعموم پتھر برسانے والی آندھی سے تباہ کی گئی ہیں۔ قرآن نے دوسری جگہ اِسے 'حَاصِب' سے تعبیر کیا ہے۔ یہ اُسی کا بیان ہے۔

۲۱۳؎ یعنی پہلے سے مقدر کر دیے گئے تھے کہ یہ پتھر قوم لوط کی بستی پر برسانے کے لیے ہیں۔

۲۱۴؎ مطلب یہ ہے کہ ہماری بھیجی ہوئی باد تند نے اُنھی کے پاؤں میں سے اٹھا کر اُن کے سروں پر برسا دیے۔

تَنْقُصُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ اِنِّيْٓ اَرٰكُمْ بِخَيْرٍ وَّ اِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ
مُّحِيْطٍ ﴿۸۴﴾ وَيٰقَوْمِ اَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ
اَشْيَآءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴿۸۵﴾ بَقِيَّتُ اللّٰهِ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ
كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ ﴿۸۶﴾ قَالُوْا يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ

لوگو، اللہ کی بندگی کرو، اُس کے سوا تمھارا کوئی معبود نہیں ہے اور ناپ اور تول میں کمی نہ کرو۔[۲۱۶] میں تمھیں خوش حال دیکھ رہا ہوں، مگر مجھے تم پر ایک ایسے دن کے عذاب کا اندیشہ ہے جو گھیرنے والا ہے۔[۲۱۷] میری قوم کے لوگو، ناپ اور تول کو ٹھیک انصاف کے ساتھ پورا رکھو اور لوگوں کو اُن کی چیزیں گھٹا کر نہ دو اور زمین میں فساد نہ پھیلاتے پھرو۔ اللہ کا دیا ہوا نفع ہی تمھارے لیے بہتر ہے، اگر تم سچے مومن ہو۔ (مجھے سمجھانا ہی ہے) اور میں تم پر نگران مقرر نہیں کیا گیا ہوں۔[۲۱۸] اُنھوں نے جواب دیا: اے شعیب، کیا

اُن کے لانے کے لیے ہمیں کوئی اہتمام نہیں کرنا پڑا۔

۲۱۵ یہ بستی ابراہیم علیہ السلام کے صاحب زادے مدیان کے نام پر مدین یا مدیان کہلاتی تھی، جو اُن کی تیسری بیوی قطورا کے بطن سے تھے۔ اِس میں زیادہ تر اُنھی کی نسل آباد تھی۔ اِس کا اصل علاقہ حجاز کے شمال مغرب اور فلسطین کے جنوب میں بحر احمر اور خلیج عقبہ کے کنارے پر واقع تھا، مگر اِس کا کچھ سلسلہ جزیرہ نماے سینا کے مشرقی ساحل پر بھی پھیلا ہوا تھا۔ اُس زمانے کی دو بڑی تجارتی شاہ راہیں اِسی علاقے سے گزرتی تھیں، اِس وجہ سے مدین کے لوگوں نے بھی تجارت میں بہت ترقی کر لی تھی۔

۲۱۶ اِس سے معلوم ہوا کہ شرک کے بعد جو سب سے بڑی برائی سیدنا شعیب کی قوم میں پیدا ہو چکی تھی، وہ یہی ناپ تول میں کمی تھی جسے اُن ظالموں نے اپنے لیے ہنر بنا لیا تھا۔

۲۱۷ یہ اُنھوں نے اِس لیے فرمایا کہ وہ خدا کے رسول تھے اور رسولوں کے باب میں یہی سنت الٰہی ہے جو ہمیشہ جاری رہی۔

۲۱۸ یعنی میرا کام تبلیغ و دعوت اور انذار و بشارت ہے۔ اِس سے زیادہ میری کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ مجھے تم پر داروغہ نہیں بنایا گیا کہ میں ضرور ہی تمھیں راہ راست پر لے آؤں۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا اِنَّكَ لَاَنْتَ الْحَلِيْمُ
الرَّشِيْدُ ﴿۸۷﴾ قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَرَزَقَنِيْ مِنْهُ رِزْقًا
حَسَنًا وَمَآ اُرِيْدُ اَنْ اُخَالِفَكُمْ اِلٰى مَآ اَنْهٰكُمْ عَنْهُ اِنْ اُرِيْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا
اسْتَطَعْتُ وَمَا تَوْفِيْقِيْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ ﴿۸۸﴾ وَيٰقَوْمِ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ

تمھاری نماز تمھیں یہ سکھاتی ہے کہ ہم اُن چیزوں کو چھوڑ دیں جنھیں ہمارے باپ دادا پوجتے رہے یا اپنے مال میں ہم اپنی مرضی کے مطابق تصرف نہ کریں[۲۱۹]؟ (تمھاری نگاہ میں سب اگلے پچھلے بے وقوف اور گمراہ تھے اور ہمارے اندر) بس تمھی ایک دانش منداور راست باز آدمی رہ گئے ہو! اُس نے کہا: میری قوم کے لوگو، ذرا غور تو کرو، اگر میں اپنے پروردگار کی طرف سے ایک روشن دلیل[۲۲۰] پر ہوں، پھر اُس نے (وحی کی صورت میں) مجھے ایک رزق حسن[۲۲۱] بھی اپنی طرف سے عطا فرمادیا (تو اِس کے سوا کس چیز کی دعوت دوں)؟[۲۲۲] میں ہرگز نہیں چاہتا کہ تمھاری مخالفت کرکے وہی کام خود کروں جس سے تمھیں روک رہا ہوں[۲۲۳]۔ میں تو صرف اصلاح چاہتا ہوں، جس حد تک کرسکوں۔ (اِس کی) توفیق مجھے اللہ ہی سے ملے گی۔ میں نے اُسی پر بھروسا کیا ہے اور اُسی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ میری قوم کے لوگو،

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

۲۱۹؎ یہ درحقیقت ایک طنزیہ فقرہ ہے اور نماز کا ذکر اِس میں دین داری کی علامت کے طور پر ہوا ہے، اِس لیے کہ اُس کا سب سے نمایاں ظہور نماز ہی کی صورت میں ہوتا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...مطلب یہ کہ تم نماز وغیرہ پڑھتے تھے تو اُس سے خیال تو یہ ہوتا تھا کہ تم سے باپ دادا کا نام بھی روشن ہوگا اور قوم کے لیے بھی کچھ کامیابی کی راہیں کھلیں گی، مگر خوب نکلی تمھاری یہ نماز کہ وہ ماضی و حاضر، سب کی بساط لپیٹ کر رکھ دینا چاہتی ہے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ حضرت شعیب کی نیک اور پاکیزہ زندگی سے چونکہ مفسدین کو اندیشہ تھا کہ وہ لوگ متاثر ہوں گے جو بالطبع نیک ہیں، اِس وجہ سے اُنھوں نے اُن کی نیکیوں ہی کو اپنے طنز کا ہدف بنالیا، گویا سارے فساد کی جڑ وہی ہیں۔'' (تدبر قرآن ۴/ ۱۶۱)

۲۲۰؎ یعنی نور فطرت جو اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے اندر ودیعت فرمایا ہے۔

۲۲۱؎ وحی کو رزق حسن سے تعبیر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ انسان کی روحانی زندگی کی بقا اِسی پر منحصر ہے۔

شِقَاقِيْٓ اَنْ يُّصِيْبَكُمْ مِّثْلُ مَآ اَصَابَ قَوْمَ نُوْحٍ اَوْ قَوْمَ هُوْدٍ اَوْ قَوْمَ صٰلِحٍ وَمَا
قَوْمُ لُوْطٍ مِّنْكُمْ بِبَعِيْدٍ ﴿۸۹﴾ وَاسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ اِنَّ رَبِّيْ رَحِيْمٌ
وَّدُوْدٌ ﴿۹۰﴾ قَالُوْا يٰشُعَيْبُ مَا نَفْقَهُ كَثِيْرًا مِّمَّا تَقُوْلُ وَاِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْنَا ضَعِيْفًا وَلَوْلَا
رَهْطُكَ لَرَجَمْنٰكَ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْنَا بِعَزِيْزٍ ﴿۹۱﴾ قَالَ يٰقَوْمِ اَرَهْطِيْٓ اَعَزُّ عَلَيْكُمْ

میرے خلاف تمھاری ہٹ دھرمی کہیں یہ نوبت نہ پہنچا دے کہ تم پر بھی وہی آفت آپڑے جو نوح کی قوم یا ہود کی قوم یا صالح کی قوم پر آ پڑی تھی اور لوط کی قوم تو تم سے زیادہ دور بھی نہیں ہے۔(اِس لیے خیریت چاہتے ہو تو میری بات سنو) اور اپنے پروردگار سے معافی چاہو، پھر اُس کی طرف پلٹ آؤ۔[۲۲۴] حقیقت یہ ہے کہ میرا پروردگار نہایت مہربان اور بڑی محبت کرنے والا ہے۔[۲۲۵] اُنھوں نے جواب دیا: اے شعیب، تمھاری بہت سی باتیں ہماری سمجھ میں نہیں آتیں[۲۲۶] اور ہم تو دیکھتے ہیں کہ ہمارے درمیان تم

۲۲۲؎ یہ جواب شرط ہے جو اصل میں محذوف ہے۔

۲۲۳؎ یعنی تمھارے خریداروں کو تم سے بدگمان کر کے بستی میں فساد پیدا کر دوں، دراں حالیکہ تم سے کہہ رہا ہوں کہ 'لَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ'۔

۲۲۴؎ ہم پیچھے بیان کر چکے ہیں کہ توبہ کے لیے استغفار اور اصلاح، دونوں ضروری ہیں۔ یہ اُنھی کی ہدایت فرمائی ہے۔

۲۲۵؎ یہ ترغیب وتشویق بھی ہے اور قبولیت توبہ کی بشارت بھی۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ''...مدعا یہ ہے کہ تمھارے جرائم کتنے ہی سنگین ہوں، لیکن جب تم صدق دل سے اُس کی طرف رجوع کرو گے تو وہ تمھیں ٹھکرائے گا نہیں، بلکہ معاف کر کے اپنی رحمتوں سے نوازے گا۔ وہ نہایت مہربان اور محبت کرنے والا ہے۔'' (تدبر قرآن ۴/ ۱۶۳)

۲۲۶؎ لوگوں کو اُن کے مالوفات کے خلاف کوئی دعوت دی جائے تو وہ بالعموم اِسی طرح کا تبصرہ کرتے ہیں۔ اِس میں ایک نوعیت کی تعریض بھی ہوتی ہے کہ تمھاری باتیں سمجھنے کی کہاں ہیں کہ کوئی معقول آدمی اُن کو سمجھنے کی کوشش کرے۔ ایسی مہمل اور دور از کار باتیں کب کسی کی سمجھ میں آتی ہیں۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

مِّنَ اللّٰهِ وَاتَّخَذْتُمُوْهُ وَرَآءَكُمْ ظِهْرِيًّا اِنَّ رَبِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ﴿۹۲﴾ وَيٰقَوْمِ
اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّيْ عَامِلٌ سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَمَنْ
هُوَ كَاذِبٌ وَارْتَقِبُوْٓا اِنِّيْ مَعَكُمْ رَقِيْبٌ ﴿۹۳﴾ وَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا شُعَيْبًا
وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَاَخَذَتِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ
دِيَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ﴿۹۴﴾ كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا اَلَا بُعْدًا لِّمَدْيَنَ كَمَا بَعِدَتْ ثَمُوْدُ ﴿۹۵﴾
وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿۹۶﴾ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۠ئِهٖ فَاتَّبَعُوْٓا

ایک کمزور آدمی ہو، تمھاری برادری نہ ہوتی تو ہم تمھیں سنگ سار کر دیتے، تم ہم پر کچھ بھاری نہیں ہو۔ شعیب نے کہا: میری قوم کے لوگو، کیا میری برادری تم پر خدا سے زیادہ بھاری ہے؟ (اُس کا تمھیں خوف ہے) اور خدا کو تم نے پس پشت ڈال رکھا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ تم کرتے ہو، میرا پروردگار اُس کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ میری قوم کے لوگو، (جو کچھ کر رہے ہو)، اپنی جگہ کیے جاؤ، میں بھی کر رہا ہوں۔ تمھیں عنقریب معلوم ہو جائے گا کہ کس پر رسوا کر دینے والا عذاب آ جاتا ہے اور کون اپنی بات میں جھوٹا ہے۔ تم انتظار کرو، میں بھی تمھارے ساتھ انتظار کر رہا ہوں۔ (اِس پر) جب ہمارا حکم صادر ہو گیا تو ہم نے شعیب کو اور اُن لوگوں کو جو اُس کے ساتھ ایمان لائے تھے، خاص اپنی رحمت سے نجات دی اور جنھوں نے (اپنی جان پر) ظلم ڈھایا تھا، اُن کو کڑک نے آ لیا اور وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے رہ گئے، گویا اُن میں کبھی بسے ہی نہیں تھے۔ سنو، مدین والے بھی دھتکارے گئے، جس طرح ثمود دھتکار دیے گئے! ۸۴-۹۵

(اِسی طرح) موسیٰ کو ہم نے اپنی نشانیوں کے ساتھ اور ایک کھلی ہوئی سند[۲۲۷] کے ساتھ فرعون اور اُس

۲۲۷؎ یہ عام کے بعد خاص کا ذکر ہے اور اِس سے عصا کا معجزہ مراد ہے۔ اِس لیے کہ یہی وہ سند ماموریت تھی جس نے ساحروں کے مقابلے میں ایک حجت قاہرہ بن کر موسیٰ علیہ السلام کے دعواے نبوت کو بالکل آخری درجے میں ثابت کر دیا تھا۔ آیت میں اِسی لحاظ سے اِس کو 'سُلْطٰنٌ مُّبِيْنٌ' سے تعبیر فرمایا ہے۔

اَمۡـرَ فِرۡعَوۡنَ وَمَآ اَمۡرُ فِرۡعَوۡنَ بِرَشِیۡدٍ ﴿۹۷﴾ یَـقۡدُمُ قَوۡمَهٗ یَوۡمَ الۡقِیٰمَةِ فَاَوۡرَدَهُمُ
النَّارَ وَبِئۡسَ الۡوِرۡدُ الۡمَوۡرُوۡدُ ﴿۹۸﴾ وَاُتۡبِـعُوۡا فِیۡ هٰذِهٖ لَعۡنَةً وَّیَوۡمَ الۡقِیٰمَةِ بِئۡسَ الرِّفۡدُ
الۡمَرۡفُوۡدُ ﴿۹۹﴾

کے سرداروں کی طرف رسول بنا کر بھیجا تھا تو اُنھوں نے فرعون کی بات مانی، دراں حالیکہ فرعون کی بات راست نہیں تھی۔ قیامت کے دن وہ اپنی قوم کے آگے آگے ہوگا اور اُنھیں دوزخ میں لے جا اتارے گا۔ کیا ہی برا گھاٹ ہے جس پر وہ اتریں گے۔ اُن کے پیچھے دنیا میں بھی لعنت لگا دی گئی اور آخرت میں بھی۔ کیا ہی برا صلہ ہے جو اُنھیں دیا گیا۔[۲۲۸] ۹۶-۹۹

۲۲۸؎ موسیٰ علیہ السلام کی سرگذشت سورۂ یونس میں بڑی تفصیل کے ساتھ بیان ہوئی ہے اور دوسرے پیغمبروں کا حوالہ بالاجمال آیا ہے۔ اِس سورہ میں معاملہ اِس کے برعکس ہے۔ اِس سے معلوم ہوا کہ یہ دونوں سورتیں ایک دوسرے کی تکمیل کر رہی ہیں۔ قرآن مجید کی سورتوں میں اِسی طرح کی چیزیں ہیں جو بتاتی ہیں کہ دونوں سورتیں توام ہیں۔

[باقی]

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

امین احسن اصلاحی
ترتیب وتدوین: خالد مسعود۔سعید احمد

مال کے ضائع کرنے اور دوہرا چہرہ رکھنے کے بارے میں

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

(مَا جَاءَ فِیْ إِضَاعَةِ الْمَالِ وَذِی الْوَجْهَیْنِ)

حَدَّثَنِیْ مَالِكٌ عَنْ سُهَیْلِ بْنِ أَبِیْ صَالِحٍ عَنْ أَبِیْهِ عَنْ أَبِیْ هُرَیْرَةَ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: إِنَّ اللّٰهَ تَبَارَكَ وَتَعَالٰی یَرْضٰی لَكُمْ ثَلَاثًا وَ یَسْخَطُ لَكُمْ ثَلَاثًا: یَرْضٰی لَكُمْ أَنْ تَعْبُدُوْهُ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَیْئًا وَ أَنْ تَعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِیْعًا وَ أَنْ تَنَاصَحُوْا مَنْ وَلَّاهُ اللّٰهُ أَمْرَكُمْ وَ یَسْخَطُ لَكُمْ قِیْلَ وَقَالَ وَإِضَاعَةَ الْمَالِ وَ كَثْرَةَ السُّؤَالِ.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تمھارے لیے تین باتوں کو پسند اور تین باتوں کو ناپسند کرتا ہے: وہ تمھارے لیے یہ پسند کرتا ہے کہ تم اس کی عبادت کرو اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہراؤ، تم سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑو اور تمھارے

معاملات پر اللہ نے جن لوگوں کو مقرر کر دیا ہے، ان کی خیر خواہی کرو۔ وہ تمھارے لیے قیل و قال، مال کو ضائع کرنے اور کثرت سوال کو ناپسند کرتا ہے۔

وضاحت

'حبل اللّٰہ' سے مراد قرآن مجید ہے۔ یہی اللہ تعالیٰ اور ہمارے درمیان رسی ہے جو تعلق کا ذریعہ ہے۔ اس کو مضبوطی کے ساتھ پکڑنے کے معنی ہیں کہ حق و باطل میں امتیاز کی یہی کسوٹی ہوگی۔ کسی چیز کے حق یا باطل ہونے میں جب بھی کوئی نزاع پیدا ہوگا تو اسی کسوٹی پر پرکھا جائے گا۔ اس کسوٹی پر جو چیز پوری نہ اترے تو نہیں لی جائے گی۔

معاملات پر مامور لوگوں سے مراد حکمران ہیں۔ حکمرانوں کی خیر خواہی کے معنی ہیں کہ آپ ان کو نیک مشورے دیں۔ خوشامد سے انھیں بیوقوف نہ بنائیں اور آسمان پر نہ چڑھائیں، غلط رہنمائی نہ کریں اور ان کی حمایت محض اس لیے نہ کریں کہ ان سے آپ کی کوئی غرض وابستہ ہے۔ یہ چیزیں نصیحت اور خیر خواہی کے بالکل خلاف ہیں۔ جب بھی موقع ملے، ان کو صحیح بات بتانی چاہیے، لیکن ادب اور وقار ملحوظ رہنا چاہیے۔ ان کو بدنام کرنے اور ذلیل کرنے کے لیے اہل سیاست کے طریقے پر بیان بازی نہیں کرنی چاہیے۔ ہمیشہ ان کی اصلاح مد نظر رہنی چاہیے، اس لیے کہ آپ کی عزت، آبرو، مال اور جان کی حفاظت ان لوگوں کی ذمہ داری ہے۔

'قیل و قال' سے مراد بکواس، مناظرہ بازی، کٹ حجتی، مین میکھ نکالنا اور فضول قسم کی کر بڑی کرنا ہے۔ مال زندگی کے قیام و بقا کا ذریعہ ہے، اس لیے اپنے مال کو ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ زیادہ سوال کرنے سے مطلب مانگنا نہیں، بلکہ غیر متعلق اور اناپ شناپ سوال کرنا ہے۔ اس کی ممانعت قرآن مجید میں بھی آئی ہے۔ سوال وہی کرنا چاہیے جو واقعی پیدا ہو، خواہ مخواہ سوالات پیدا کرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔ یہ طرز عمل دین کو یہودیت کا مجموعہ بنا دیتا ہے۔

وَحَدَّثَنِی مَالِكٌ عَنْ أَبِی الزِّنَادِ عَنِ الْأَعْرَجِ عَنْ أَبِی هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: مِنْ شَرِّ النَّاسِ ذُوالْوَجْهَيْنِ الَّذِی يَأْتِی هٰؤُلَاءِ بِوَجْهٍ، وَهٰؤُلَاءِ بِوَجْهٍ.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بدترین خلائق

دورخا آدمی ہے، جو ایک کے پاس آئے تو ایک شکل میں آئے اور دوسرے کے پاس جائے تو کچھ اور بن کر جائے۔

وضاحت

آدمی کو بالکل دوٹوک ہونا چاہیے۔ یہ نہیں ہونا چاہیے کہ

باما شراب خوردو بازاہد نماز کرد

آدمی کو اس حد تک صاف گو ہونا چاہیے کہ ہر ذہین آدمی اس کے معاملے میں اندازہ کر لے کہ اس کا موقف کیا ہو گا اور وہ کیا طریقہ اختیار کرے گا۔ اگر اس سے کوئی بات کہی جائے تو کیا جواب دے گا۔

(تدبر حدیث ۵۱۶-۵۱۸)

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

معز امجد
ترجمہ وتدوین: شاہد رضا

مسلمانوں کی ایک حالت

رُوِیَ أَنَّہُ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ: إِذَا کَانَ أُمَرَاؤُکُمْ خِیَارَکُمْ وَأَغْنِیَاؤُکُمْ سُمَحَاءَ کُمْ وَأُمُوْرُکُمْ شُوْرٰی بَیْنَکُمْ فَظَھْرُ الْأَرْضِ خَیْرٌ لَّکُمْ مِّنْ بَطْنِھَا وَ إِذَا کَانَ أُمَرَاؤُکُمْ شِرَارَکُمْ وَأَغْنِیَاؤُکُمْ بُخَلَاءَ کُمْ وَأُمُوْرُکُمْ إِلٰی نِسَائِکُمْ فَبَطْنُ الْأَرْضِ خَیْرٌ لَّکُمْ مِّنْ ظَھْرِھَا.

روایت کیا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب تمھارے بہترین لوگ تمھارے حکمران ہوں، تمھارے مال دار سخی تر ہوں اور تمھارے اجتماعی معاملات آپس میں مشورے سے طے پاتے ہوں، تو تمھارے لیے زمین کی پیٹھ اس کے پیٹ سے بہتر ہے[1]۔ مگر جب تمھارے بدترین لوگ تمھارے حکمران ہوں، تمھارے مال دار بخیل ہوں اور تمھارے اجتماعی معاملات تمھاری عورتوں کے ہاتھوں میں ہوں، تو زمین کا پیٹ تمھارے لیے اس کی پیٹھ سے بہتر ہے[2]۔

---

[1] یعنی اس زمین پر زندگی گزارنا موت سے بہتر ہے۔

[2] یعنی اس زمین پر زندگی گزارنے سے موت بہتر ہے۔

وضاحت

یہ روایت ترمذی، رقم ۲۲۶۶ میں روایت کی گئی ہے۔ یہ صرف ایک ہی سند سے مروی ہے۔اس سند میں ایک راوی صالح بن بشیر المری ہیں جن کو غیر ثقہ گردانا گیا ہے۔ان کے بارے میں بعض محدثین کی آرا ذیل میں بیان کی جاتی ہیں:

علامہ ابن عدی اپنی کتاب ''الکامل فی ضعفاء الرجال'' میں بیان کرتے ہیں:

قال یحیی بن معین: صالح المُرِّی ضعیف أو قال: لیس بشیء ... سألت أحمد بن حنبل عن صالح المری قال: صالح صاحب قصص یقص علی الناس لیس هو صاحب حدیث ولا إسناد ولا یعرف الحدیث، وقال عمرو بن علی: وصالح المری هو رجل صالح منکر الحدیث جدًّا یحدث عن قوم ثقات بأحادیث مناکیر...ثنا البخاری قال: صالح بن بشیر أبو بشر المُرّی البصری القاص منکر الحدیث... قال السعدی: صالح المری کان قاصًا واهی الحدیث وقال النسائی: فیما أخبرنی محمد بن العباس عنه قال: صالح المری بصری متروک الحدیث. (۶۰/۴)

''یحییٰ بن معین کہتے ہیں: صالح المری ضعیف ہے یا کہا کہ وہ کچھ نہیں ہے...میں نے امام احمد بن حنبل سے صالح المری کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے کہا کہ صالح المری ایک قصہ گو تھا جو لوگوں کے سامنے قصے بیان کرتا تھا، وہ کوئی محدث یا سلسلۂ اسناد میں سے نہیں تھا اور نہ وہ حدیث جانتا تھا۔عمرو بن علی کہتے ہیں: صالح المری ایک صالح آدمی تھا، مگر بہت منکر الحدیث تھا جو ثقہ راویوں کی طرف منسوب کر کے منکر احادیث روایت کرتا تھا...امام بخاری کہتے ہیں: صالح بن بشیر ابو بشر المری البصری ایک قصہ گو اور منکر الحدیث تھا... سعدی کہتے ہیں: صالح المری ایک قصہ گو اور واہی الحدیث تھا۔امام نسائی کہتے ہیں کہ مجھے محمد بن عباس نے خبر دی کہ صالح المری بصری متروک الحدیث ہے۔''

صاحب ''الکاشف'' لکھتے ہیں:

...وقال أبو داؤد: لا یکتب حدیثه. (۴۹۳/۱)

''...اور ابوداؤد کہتے ہیں کہ اس کی حدیثیں نہ لکھی جائیں (اس کی احادیث قابل قبول نہیں ہیں)۔''

علامہ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ ''تہذیب التہذیب'' میں کہتے ہیں:

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

...وقال الدارقطني: ضعيف. (۳۳۴/۴)		"...اور دارقطنی کہتے ہیں کہ وہ ضعیف ہے[۳]۔"

حاصل بحث

چونکہ یہ روایت ایسی سند کے ذریعے سے روایت کی گئی ہے جس میں ایک راوی ـــــ صالح بن بشیر المری ـــــ ضعیف اور غیر ثقہ ہیں، اس لیے ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ واقعتاً نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

۳۔ صالح بن بشیر المری کے بارے میں مزید معلومات کے لیے ملاحظہ کیجیے: الکامل فی ضعفاء الرجال، ابن عدی ۴/ ۶۰-۶۳؛ المجروحین، ابن ابی حاتم ۱/ ۳۷۱-۳۷۳؛ الجرح والتعدیل، ابن ابی حاتم ۴/ ۳۹۵؛ الضعفاء الصغیر، بخاری ۱/ ۵۸؛ التاریخ الکبیر، بخاری ۴/ ۲۷۳؛ الکاشف، ذہبی ۱/ ۴۹۳؛ تہذیب التہذیب، ابن حجر عسقلانی ۴/ ۳۳۴؛ تقریب التہذیب، ابن حجر عسقلانی ۱/ ۲۷۱؛ لسان المیزان، ابن حجر عسقلانی ۷/ ۲۴۴ اور الضعفاء الکبیر، عقیلی ۲/ ۱۹۹۔

امام حمید الدین فراہی

تعیین خطاب

مسلمان اس بات پر متفق ہیں کہ پورا قرآن اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، یعنی اس کو اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمایا ہے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ قرآن میں تمام خطاب بھی اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہے۔ مثلاً 'اِیَّاكَ نَعۡبُدُ وَاِیَّاكَ نَسۡتَعِیۡنُ'* (ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں) میں ظاہر ہے کہ خطاب بندہ کی طرف سے ہے۔ علما اس کی توجیہ یوں کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ سورہ تعلیم فرمائی ہے، گویا یوں فرمایا کہ اس طرح کہو، لیکن یہاں ''کہو'' کا لفظ موجود نہیں ہے تو اس مقدر کو کیسے جانا جائے؟

اسی طرح کا سوال مخاطب کے بارہ میں بھی پیدا ہوتا ہے، یعنی خطاب کن سے ہے؟ ہر خطاب میں دو پہلو ہوتے ہیں: ایک یہ کہ مخاطب کرنے والا کون ہے؟ دوسرا یہ کہ مخاطب کون ہے؟ اور ان دونوں کا حال یہ ہے کہ کبھی یہ عام ہوتے ہیں اور مراد ان سے خاص ہوتی ہے، اور کبھی اس کے بالکل برعکس۔ اور چونکہ جہت خطاب کی تبدیلی اور اس کے عام یا خاص ہونے کی وجہ سے معانی میں بڑی بڑی تبدیلیاں ہو جاتی ہیں، لہٰذا ضروری ہے کہ اس کے لیے ایسے اصول دریافت کیے جائیں جو مشکلات میں رہنمائی کر سکیں، کیونکہ اس معاملہ میں بعض مرتبہ ایسی غلطیاں ہو جاتی ہیں جو آدمی کو شائبۂ شرک کے قریب پہنچا دیتی ہیں۔ مولانا روم ایک جگہ یہ تک کہہ گزرے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو نبی کا بندہ بنا دیا ہے، کیونکہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا ہے کہ آپ لوگوں کو 'یٰعِبَادِیَ الَّذِیۡنَ اَسۡرَفُوۡا الآیة'** (اے میرے بندو جنھوں نے زیادتی کی) کے الفاظ سے خطاب کریں۔ مولانا روم کے متعلق میرا یہ

---

* الفاتحہ ۱:۴۔

** الزمر ۳۹:۵۳۔

گمان نہیں ہے کہ انھوں نے فی الحقیقت نبی کو خدا کا شریک بنانا چاہا ہے، لیکن بات ان کی زبان سے ایسی نکل گئی ہے جو مشرکین کے اقوال سے مشابہت رکھتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی اس لغزش کو معاف فرمائے۔ اس آیت میں خطاب کی نوعیت بالکل واضح ہے۔ 'یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا الآیۃ' کا خطاب اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کی طرف ہے۔ اس کے شروع میں جو 'قُلْ' ہے، وہ پیغمبر کو خطاب ہے کہ آپ یہ پیغام حرف بحرف بندوں کو پہنچا دیں۔

کسی عام کلام کی توجیہ اس کی خاص جہت خطاب کے اعتبار سے ایک مستقل باب ہے۔ تعیین خطاب کا علم اسی باب کا ایک شعبہ ہے۔ جس شخص پر کلام کا صحیح رخ واضح نہیں ہوگا، وہ اس کی صحیح تاویل تک ہرگز نہیں پہنچ سکتا۔ پس یہ باب تاویل اور نظم کلام کے فہم کی کلید ہے اور اس سے بے خبری بہت سی غلطیوں اور ٹھوکروں کا سبب ہو سکتی ہے۔ ایک مستقل مقدمہ[1] میں ہم علم توجیہ کے عام قواعد بیان کریں گے۔ اصول بیان کرنے سے پہلے یہ مقدمہ ہم نے محض اس لیے لکھ دیا ہے کہ فی الجملہ اس مسئلہ سے لوگوں کو انس ہو جائے۔ مسئلۂ خطاب ان بہت سی غلطیوں کی اصلاح کرتا ہے جن میں ہمارے مفسرین مبتلا ہیں۔ پس ضروری ہے کہ ہم اس پر علیحدہ بحث کریں۔

خطاب میں جب مختلف پہلوؤں کا امکان ہو تو اس کو لفظ مشترک کی طرح سمجھنا چاہیے اور اس میں بعض پہلوؤں کا اختیار کرنا اور بعض کو چھوڑنا ناگزیر ہوگا۔ جس طرح ایک لفظ مشترک کے تمام معانی کو ہم معلوم کرتے ہیں اور پھر سیاق کلام کی روشنی میں کسی معنی کو اختیار کرتے ہیں اور کسی کو چھوڑتے ہیں، وہی طرز عمل ہمارا اس وقت ہوگا جب کوئی خطاب مختلف پہلوؤں کا احتمال رکھتا ہو۔ لہٰذا اولین شے اس سلسلہ میں یہ ہے کہ ہم خطاب کے مختلف پہلو معلوم کریں۔

خطاب میں ایک مصدر ہوتا ہے اور ایک منتہیٰ۔

مصدر یا تو اللہ تعالیٰ ہوگا یا جبریل یا رسول یا لوگ۔

اسی طرح منتہیٰ یا تو اللہ تعالیٰ ہوگا یا رسول یا لوگ۔

لوگوں میں مسلمان ہوں گے یا منافقین یا اہل کتاب یا ذریت اسمٰعیل یا ان میں سے دو یا تین یا سب۔

اہل کتاب میں سے یا تو یہود ہوں گے یا نصاریٰ یا دونوں۔

یہ پہلو تو بالکل ظاہر ہیں۔ اب ان کے اختلاط والتباس کی صورتوں پر غور کرنا چاہیے۔

---

[1] اس مسئلہ کی پوری توضیح مولانا نے اپنی کتابوں ''اصول التاویل'' اور ''کتاب الاسالیب'' میں فرمائی ہے۔ یہاں یہ بحث ناتمام رہ گئی ہے۔ مذکورہ دونوں کتابیں ابھی شائع نہیں ہو سکی ہیں۔ (مترجم)

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

مصدر میں التباس اللہ تعالیٰ، رسول اور جبریل کے مابین ہوتا ہے۔ اگر تم بغیر تنبیہ کے قرآن پڑھتے چلے جاؤ تو یہ امتیاز کرنا مشکل ہوگا کہ قائل کون ہے؟ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت جبریل اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔ یہ کبھی تو بعینہٖ مرسل کا قول نقل کر دیتے ہیں، اور کبھی وہ بات بطور خود ادا کر دیتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ان کی زبان پر جاری فرمائی ہے۔ پھر حضرت جبریل اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔ یہ کبھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے محض مبلغ کلام الٰہی کی حیثیت سے کلام کرتے ہیں اور کبھی آپ کے معلم کی حیثیت سے، یہ ان کے معلم ہونے کی حیثیت خود اللہ تعالیٰ نے واضح کر دی ہے: 'عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى، ذُوْ مِرَّةٍ فَاسْتَوٰى'*۔

پھر یہ تمام حیثیات ایک دوسرے کے ساتھ ملی جلی ہوئی بغیر کسی تنبیہ کے نمایاں ہوتی ہیں اور سیاق کلام کے سوا کوئی اور چیز اس باب میں رہنمائی کرنے والی نہیں ہوتی۔

اور یہ بات کچھ قرآن مجید ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، بلکہ انبیا کے کلام کی یہ ایک مشترک خصوصیت معلوم ہوتی ہے۔ زبور میں بھی اس کی مثال موجود ہے، دیکھو باب ۴۶ آیات ۷-۱۱: ''لشکروں کا خداوند ہمارے ساتھ ہے..... خاموش ہو جاؤ اور جان لو کہ میں خدا ہوں..... لشکروں کا خداوند ہمارے ساتھ ہے۔''

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

قاعدہ کلیہ اس باب میں یہ ہے کہ جب کلام صریحاً اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوگا تو اس میں جلال و ہیبت اور قوت و سطوت کا اظہار ہوگا۔ لہٰذا اس طرح کا کلام ضرورت کے مواقع پر نمودار ہوتا ہے۔ ہم یہاں بعض مثالیں پیش کرتے ہیں تاکہ ہمارا مدعا سمجھنے میں تم کو آسانی ہو۔

مثلاً سورۂ اقرأ شروع سے حضرت جبریل کی زبان سے ہے، لیکن جب غصہ کے اظہار کا موقع آیا ہے تو کلام صراحت کے ساتھ خدا کی طرف سے ہو گیا ہے: 'كَلَّا لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ لَنَسْفَعًاۢ بِالنَّاصِيَةِ**.....' (یہ کچھ نہیں، اگر باز نہ آیا تو ہم چوٹی پکڑ کر گھسیٹیں گے)۔

منتہیٰ میں التباس پیغمبر اور مومنین کے درمیان ہوتا ہے۔ بعض مرتبہ مخاطب بظاہر تو پیغمبر ہوتا ہے، لیکن فی الحقیقت روئے سخن امت کی طرف ہوتا ہے۔ پیغمبر امت کے وکیل ہونے کی حیثیت سے ان کی زبان اور ان کا کان ہوتا ہے، اس لیے مخاطب اسی کو کیا جاتا ہے۔ تورات میں اس کی مثالیں بہت ہیں کہ مخاطب تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بصیغۂ واحد کیا گیا ہے، لیکن اس سے مراد ان کی امت ہے۔ قرآن مجید میں اس طرح کے مواقع میں نظم و سیاق کی رہنمائی سے

* النجم ۵۳: ۵-۶۔ ''اس کو ایک مضبوط قوتوں والے، عقل و کردار کے توانا نے تعلیم دی ہے۔''

** ۹۶: ۱۵۔

معلوم ہوتا ہے کہ مخاطب کون ہے؟ سورۂ توبہ میں ایک آیت ہے:

اِنْ تُصِبْكَ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ وَاِنْ تُصِبْكَ مُصِيْبَةٌ يَّقُوْلُوْا قَدْ اَخَذْنَآ اَمْرَنَا مِنْ قَبْلُ. (۹:۵۰)

''اگر تم کو بھلائی پہنچتی ہے تو ان کو تکلیف ہوتی ہے اور اگر کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو کہتے ہیں: خوب ہوا، ہم نے اپنا بچاؤ پہلے ہی کر لیا۔''

یہاں خطاب واحد کا ہے، لیکن مراد اس سے عام مومنین ہیں۔ چنانچہ اس کے جواب سے اس کی وضاحت ہو گئی ہے:

قُلْ لَّنْ يُّصِيْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا هُوَ مَوْلٰنَا وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ. (۹:۵۱)

''کہہ دو، نہیں پہنچے گی ہم کو کوئی مصیبت، مگر جو اللہ نے ہمارے لیے لکھ دی ہے۔ وہ ہمارا مولیٰ ہے اور چاہیے کہ اللہ ہی پر بھروسا کریں اہل ایمان۔''

اسی طرح سورۂ بنی اسرائیل میں مخاطب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو کیا ہے، لیکن خطاب امت کی طرف ہے۔ مثلاً:

اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا. (۱۷:۲۳)

''اگر تمھارے سامنے ان میں سے ایک یا دونوں بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو نہ ان کو اف کہنا اور نہ ان کو جھڑکنا اور ان سے ادب کی بات کہنا۔''

اسی طرح کی متعدد مثالیں عام خطاب کی ہیں۔ مثلاً سورۂ بقرہ میں ہے:

اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ. (۲:۱۰۷)

''کیا تم نہیں جانتے کہ اللہ ہی کے لیے ہے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اور تمھارے لیے اللہ کے سوا کوئی کارساز اور مددگار نہیں ہے۔''

اسی قاعدہ پر ہم آیت ذیل کو بھی محمول کرتے ہیں............(بیاض)[۲]۔

(مجموعہ تفاسیر فراہی ۶۰-۶۳)

۲؎ یہاں بھی مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے مسودہ میں خالی جگہ چھوڑ دی ہے اور ایک نہایت اہم بحث ناتمام رہ گئی ہے۔ (مترجم)

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

محمد وسیم اختر مفتی

حضرت عمیر بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

حضرت عمیر بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ مشہور صحابی سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے چھوٹے اور سگے بھائی تھے، بنوزہرہ بن کلاب سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے والد کا نام مالک بن وہیب (یا اہیب) تھا، لیکن اپنی کنیت ابو وقاص سے مشہور تھے۔ عبد مناف حضرت عمیر کے پڑدادا تھے۔ حضرت عمیر کے دادا وہیب آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نانا وہب کے بھائی تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ کا نام آمنہ بنت وہب بن عبد مناف تھا، اس لحاظ سے حضرت عمیر اور ان کے بھائی حضرت سعد بن ابی وقاص آپ کے ماموں ہوئے۔ پانچویں جد کلاب بن مرہ پر حضرت عمیر کا شجرہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلۂ نسب سے مل جاتا ہے۔ حضرت عمیر کی والدہ کا نام حمنہ بنت سفیان تھا، پانچویں پشت قصی پر ان کا شجرۂ نسب بھی آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے شجرہ سے جا ملتا ہے۔

حضرت عمیر بن ابی وقاص سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی دعوت پر مسلمان ہوئے۔ ایمان کی طرف لپکنے والے اصحاب رسول کی فہرست میں جنھیں قرآن مجید نے 'السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ'* کا نام دیا ہے، ان کا نمبر اکیسواں تھا، جبکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ابھی دار ارقم میں منتقل نہ ہوئے تھے۔ ابن اسحاق کی بیان کردہ اس ترتیب میں حضرت عمیر کے بڑے بھائی حضرت سعد بن ابی وقاص آٹھویں اور حضرت عامر بن ابی وقاص گیارھویں نمبر پر آتے ہیں۔ حضرت سعد اور حضرت عامر کے حالات زندگی بیان کرتے ہوئے مؤرخین نے بتایا ہے کہ کس طرح ان کی والدہ نے اپنے بیٹوں کے قبول اسلام پر واویلا کیا اور بھوک ہڑتال کر کے دین آبا کی طرف رجوع کرنے پر مجبور کیا۔ حضرت عمیر بن

* التوبہ ۹: ۱۰۰۔

ابی وقاص کے ترجمہ میں ایسا کوئی واقعہ ذکر نہیں کیا گیا۔ حضرت عمیر اپنے بھائیوں کے قبول اسلام کے کچھ دنوں بعد ایمان لائے۔ شاید تب تک ان کی والدہ کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا تھا یا اس کی طرف سے دوبارہ یہ ردعمل اس لیے دیکھنے میں نہیں آیا کہ حضرت عمیر اس وقت بہت چھوٹی عمر کے تھے۔ جنگ بدر میں شمولیت کے وقت ان کی عمر سولہ سال بتائی گئی ہے، قبول اسلام کے وقت لامحالہ ۷/۸ برس کے رہے ہوں گے، یہی وجہ ہے کہ وہ شدائد سے محفوظ رہے اور انھیں اپنے بڑے بھائی حضرت عامر بن ابی وقاص کی طرح حبشہ ہجرت کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔

السابقون الاولون کی اکثریت نوجوانوں پر مشتمل تھی۔ حضرت علی دس سال کے تھے کہ نعمت ایمان سے مالا مال ہوئے، حضرت زبیر بن عوام نے سولہ برس کی عمر میں اور حضرت ابوعبیدہ بن جراح نے سترھویں سن میں یہ نعمت پائی۔ حضرت عمیر کے بھائی حضرت سعد بن ابی وقاص قبول اسلام کے وقت سترہ یا انیس برس کے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مشرکین مکہ کی طرف سے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم پر الزام لگایا گیا کہ آپ ہمارے نوجوانوں کو برانگیخت کرتے ہیں۔ نوجوان سچائی کو جلد قبول کر لیتے ہیں، تاریخ شاہد ہے کہ ہر پیغمبر کی دعوت پر سب سے پہلے نوخیزوں ہی نے لبیک کہا۔ چنانچہ عہد نبوی کے زیادہ تر بوڑھے بھی دین حق کی طرف مائل نہ ہوئے۔ کسی دانا نے جوانی کے ایک طاقت ہونے کی کیا خوب مثال دی ہے: سورج دوپہر کو اتنا روشن نہیں کرتا جتنا صبح کو تاب ناک کرتا ہے۔ جوانی میں موت بھی نیند کے مانند معلوم ہوتی ہے۔ ایک درخت جوانی ہی میں پھل دیتا ہے، بوڑھا ہو جائے تو اس سے لکڑی کے سوا کچھ نہیں حاصل ہوتا۔ حضرت عمیر ابھی اس عمر کو نہ پہنچے تھے جسے قرآن مجید نے 'بَلَغَ اَشُدَّهٗ' سے تعبیر کیا ہے۔ اس ارشاد ربانی کا لفظی ترجمہ تو یہی ہے کہ ''وہ سن بلوغت کو پہنچا''، تاہم اس کے بعد 'وَاسْتَوٰٓی'* (اور وہ سنبھلا) اور 'وَبَلَغَ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً'** (وہ چالیس سال کی عمر کو پہنچا) کے عطف ہونے سے اشارہ ملتا ہے کہ اس سے مراد محض طبعی بلوغت (puberty) نہیں، بلکہ عقل کی پختگی اور فہم و دانش کا حاصل ہو جانا ہے۔ عام مشاہدہ ہے کہ تیس سال سے ذرا کم یا زیادہ کا نوجوان اچھی سوجھ بوجھ کا حامل ہو جاتا ہے۔ سورۂ یوسف میں ارشاد ہوا: 'وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗٓ اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا'*** (اور جب یوسف جوان ہوئے تو ہم نے انھیں قوت فیصلہ اور علم و دانش عطا کیے)۔ اس فرمان میں سن و سال کا ذکر نہ ہونے سے معلوم ہوا کہ نبوت اور کار امامت کے لیے چالیس سال کی شرط ضروری نہیں۔

---

* القصص ۲۸: ۱۴۔

** الاحقاف ۴۶: ۱۵۔

*** یوسف ۱۲: ۲۲۔

مدینہ میں بھی نوجوان ہی اسلام کی طرف لپکتے رہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیس سالہ حضرت معاذ بن جبل کو معلم اور اکیس سالہ حضرت عتاب بن اسید کو مکہ کا گورنر مقرر کیا۔ حضرت اسامہ بن زید ابھی اکیس سال کے نہ ہوئے تھے کہ آپ نے ان کو تین ہزار کی اس فوج کا سپہ سالار مقرر فرمایا جو آپ نے رومیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے ترتیب دی تھی۔ حضرت سمرہ بن جندب روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (جنگ میں) مشرک بوڑھوں کو ختم کر دو اور (بچوں اور) نوجوانوں کو زندہ رہنے دو (ابوداؤد، رقم ۲۶۷۰، ترمذی، رقم ۱۵۸۳)، یعنی جنگ کی صلاحیت، طاقت اور رائے رکھنے والے لوگوں کو نشانہ بناؤ، خواہ وہ بوڑھے ہوں یا پختہ عمر کے جوان۔ امام احمد بن حنبل کے صاحب زادے عبداللہ کہتے ہیں کہ میں نے اپنے والد سے اس فرمان نبوی کی شرح پوچھی تو انھوں نے کہا کہ بوڑھے کے اسلام لانے کی کوئی خاص توقع نہیں ہوتی، جبکہ نوجوان حق قبول کر لیتا ہے، گویا وہ اسلام کے زیادہ قریب ہوتا ہے (احمد، رقم ۲۰۰۲۱)۔

حضرت براء بن عازب فرماتے ہیں کہ سب سے پہلے حضرت مصعب بن عمیر اور حضرت عمرو بن ام مکتوم نے مدینہ کی طرف ہجرت کی اور ان دونوں نے اہل مدینہ کو قرآن پڑھانا شروع کیا۔ ان کے بعد حضرت بلال، حضرت سعد بن ابی وقاص اور حضرت عمار بن یاسر مدینہ پہنچے، پھر حضرت عمر نے بیس صحابہ کی معیت میں مدینہ کا سفر کیا (بخاری، رقم ۳۹۲۵)۔ اس روایت میں حضرت عمیر بن ابی وقاص کا ذکر نہیں آیا، تاہم وہ ہجرت میں اپنے بڑے بھائی حضرت سعد کے ساتھ شریک تھے۔ دونوں نے اس گھر اور باغ میں سکونت اختیار کی جو ان کے مشرک بھائی عتبہ بن ابی وقاص نے قبیلۂ بنوعمرو بن عوف میں تعمیر کر رکھا تھا۔ عتبہ جنگ بعاث سے قبل مکہ میں کسی کو قتل کر کے یثرب کو بھاگ گیا تھا، اس نے بنوعمرو میں پناہ لی۔ ابن اسحاق کی روایت مختلف ہے، وہ کہتے ہیں کہ حضرت ابوسلمہ بن عبدالاسد کو پہلا مہاجر ہونے کا شرف حاصل ہے۔ ان کے بعد حضرت عامر بن ربیعہ، ان کی اہلیہ حضرت لیلیٰ، حضرت ابوحذیفہ بن عتبہ، حضرت عبداللہ بن جحش، ان کی اہلیہ اور بھائی حضرت ابواحمد عبد بن جحش دار ہجرت پہنچے۔

مدینہ آمد کے بعد آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمیر بن ابی وقاص اور انصار کے حضرت عمرو بن معاذ کے درمیان مواخات قائم فرمائی۔

حضرت عمیر بن ابی وقاص نے جنگ بدر میں حصہ لیا تو ان کی عمر سولہ برس تھی۔ ہفتہ ۱۲/ رمضان ۲ھ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سوا تین سو جاں نثار صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ مدینہ سے نکلے۔ شہر سے ایک میل باہر ابوعنبہ یا ابوعتبہ کے کنویں پر پہنچ کر آپ نے پانی نوش فرمایا اور اپنے اصحاب کو بھی سیر ہونے کو کہا۔ پھر فوج کا معائنہ فرما کر ان

کم عمر بچوں کو واپس جانے کا حکم دیا جو شوق شہادت میں ساتھ آ گئے تھے۔اس موقع پر حضرت عمیر چھپتے پھر رہے تھے۔ان کے بڑے بھائی حضرت سعد بن ابی وقاص نے پوچھا: کیا ماجرا ہے؟ کہا: اندیشہ ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مجھے دیکھ لیں گے اور کم سنی کی وجہ سے لوٹا دیں گے۔میں تو جنگ میں حصہ لینا چاہتا ہوں، ہوسکتا ہے، اللہ مجھے شہادت ہی سے سرفراز کر دے۔آخر کار وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش ہوئے تو آپ نے لوٹ جانے کو کہا۔حضرت عمیر رونے لگ گئے تو آپ نے اجازت مرحمت فرما دی۔حضرت سعد نے کم سن حضرت عمیر کے گلے میں تلوار حمائل کی جوان کے قد سے بڑی معلوم ہوتی تھی۔اب سپاہ اسلامی کا عدد تین سو پانچ (۳۰۵) ہو چکا تھا، ان میں چوہتر (یا چھیتر) مہاجرین اور بقیہ انصار تھے۔ان آٹھ اصحاب کو شامل کر کے، جنھیں کسی عذر کی بنا پر مدینہ میں رہنے کی اجازت دی گئی تھی، تین سو تیرہ (۳۱۳) کا عدد پورا ہو جاتا تھا۔

حضرت عمیر کی آرزو پوری ہوئی اور ان کا شمار ان چودہ اصحاب رسول میں ہوا جو غزوۂ فرقان میں شہادت سے سرفراز ہوئے۔ان میں سے چھ مہاجر اور آٹھ انصاری تھے۔حضرت عمیر کو عاص بن سعید نے شہید کیا اور عاص کو حضرت سعد بن ابی وقاص نے انجام تک پہنچایا۔ابن حجر کہتے ہیں کہ عمرو بن عبدود نے ان کی جان لی اور خود وہ جنگ خندق میں حضرت علی کے ہاتھوں جہنم رسید ہوا۔حضرت عمیر کی شہادت کی کوئی تفصیل بیان ہوئی نہ مقتولین مکہ میں سے کسی کے بارے میں یہ بتایا گیا ہے کہ اسے حضرت عمیر نے جہنم رسید کیا۔خیال ہے کہ حضرت عمیر بن ابی وقاص لڑتے لڑتے کسی مشرک کے تیر و تلوار کا نشانہ بن گئے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

حضرت سعد بن ابی وقاص بیان کرتے ہیں کہ ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک پیالے میں کھانا لایا گیا۔آپ نے کھایا تو کچھ بچ گیا، پھر فرمایا: اہل جنت میں سے ایک شخص اس کشادہ راستے سے آئے گا اور یہ بچا ہوا کھانا کھا لے گا۔حضرت سعد کہتے ہیں کہ میں اپنے بھائی حضرت عمیر بن ابی وقاص کو وضو کرتا چھوڑ کر آیا تھا۔میں نے سوچا کہ وہی آئیں گے، لیکن حضرت عبداللہ بن سلام آئے اور وہ کھانا کھا لیا (احمد، رقم ۱۴۵۸، مستدرک حاکم، رقم ۵۷۵۹)۔

حضرت عمیر بن ابی وقاص کو قرآن مجید سے بہت شغف تھا۔وہ نازل ہونے والی آیات کی تلاوت بڑی خوبی سے کرتے تھے۔ابتداے اسلام ہی میں شہادت پا جانے کی وجہ سے حضرت عمیر سے کوئی روایت مروی نہیں۔

مطالعۂ مزید: السیرۃ النبویۃ (ابن ہشام)، الطبقات الکبریٰ (ابن سعد)، المنتظم فی تواریخ الملوک والامم (ابن جوزی)، الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب (ابن عبدالبر)، اسد الغابۃ فی معرفۃ الصحابۃ (ابن اثیر)، البدایۃ والنہایۃ (ابن کثیر)، الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ (ابن حجر)، Youth is Strength (Ashur Shamis)۔

رضوان اللہ

بعد از موت

زندگی اور موت، ان دونوں کی حقیقت کیا ہے؟ اس سوال کا جواب ہر کوئی اپنے اپنے انداز اور علم و تجربہ سے دیتا ہے۔ عام لوگوں کے نزدیک اگر کوئی انسان اُٹھتا بیٹھتا، چلتا پھرتا، کھاتا پیتا، دوسروں کی سنتا اور اپنی سناتا ہے، یا دوسرے لفظوں میں، جب تک اس میں ذرا سی بھی حرکت محسوس ہوتی ہو، وہ زندوں میں شمار ہوتا ہے۔ اور یہ جان لینے کے بعد کہ زندگی کیا ہے، موت کو جان لینا اب ان کے لیے کچھ مشکل نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ زندگی اور موت، باہم متضاد صفات ہیں، ان میں سے ایک کو سمجھ لیا جائے تو دوسری خود بخود واضح ہو جاتی ہے۔ جیسے روشنی اور اندھیرے کی مثال میں ہم دیکھتے ہیں کہ روشنی کو جان لینے کے بعد اندھیرے کو آسانی سے جان لیا جا سکتا ہے کہ اندھیرا کچھ بھی نہیں، محض روشنی کا نہ ہونا ہے۔ چنانچہ زندگی اگر حرکت کا نام ہے تو پھر موت بھی ان لوگوں کے ہاں بس جمود ہے، اس کے سوا کچھ نہیں۔

بعض حضرات کے نزدیک ان حرکات و سکنات سے قطع نظر، دماغی حیات اصل زندگی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ انسان کا دماغ جب تک شعوری کیفیت میں ہوتا اور سمجھ بوجھ کا عمل کرتا رہتا ہے، اس وقت تک وہ زندہ ہے۔ جب تمام شعوری احساسات ختم ہو جائیں، اُس وقت اس کے جسم کی حالت کیسی ہی کیوں نہ ہو، وہ حقیقت میں مردہ ہی ہے۔ ایسے شخص پر زندگی کے تمام حکم ساقط ہو جاتے اور اس کی اپنی ہر بات بھی معطل ہو کر رہ جاتی ہے۔

کچھ لوگ ایسے شخص کو بھی کہ جس کی دماغی موت کا اعلان ہو چکا ہو، اس وقت تک زندہ جانتے ہیں جب تک دل دھڑک کر اور پھیپھڑے سکڑ پھیل کر اپنی ہستی کا احساس دلاتے رہیں۔ ان کے نزدیک جب دھڑکنیں تھم جائیں اور

سانسیں رک جائیں، تب جا کر زندگی ختم اور اس کا مسافر عازم عدم ہوتا ہے۔

زندہ کون ہوتا ہے اور مردہ کسے کہتے ہیں، یہ جان لینے کے بعد دوسرا سوال اٹھتا ہے کہ ہر زندہ کو کیا ضرور ہی مرنا ہے؟ اس کے جواب میں ہر کوئی ایک ہی بات کرے گا کہ موت زندگی کی تلخ ہی سہی، مگر اٹل حقیقت ہے۔ ان دونوں کا رشتہ ایسا لازوال ہے کہ صدیاں بیت گئیں، مگر زندگی موت سے بے پروا ہوئی اور نہ موت نے اسے اپنے چنگل سے آزاد کیا۔ اس کش مکش میں فاتح بھی ہمیشہ موت ہی رہی۔ یعنی یہ تو بار ہا ہوا کہ زندگی ہر دم بھاگتی رہی اور موت اس کے تعاقب میں رہی، یا کبھی زندگی موت کی موت بن کر اس کے مقابل میں بھی آن کھڑی ہوئی، مگر جیت بالآخر موت ہی کے حصے میں آئی۔ یہی وجہ ہے کہ ماضی کی ہر داستان اس کی فتح کو بیان کرتی، موجودہ دور اسی کے تسلط کی شہادت دیتا، حتیٰ کہ مستقبل بھی اسی کی برتری کی دہائی دیتا نظر آتا ہے۔

مذکورہ بالا سطور سے دو چیزیں مزید معلوم ہوتی ہیں:

ایک یہ کہ کون زندہ ہے اور کون مردہ، یہ جاننا انسانی عقل و تجربہ اور اس کے مشاہدے ہی کی چیز ہے اور علم کے انھی ذرائع کی بنیاد پر ہمیشہ سے کسی کے جینے اور مرنے کا فیصلہ ہوتا آیا ہے۔ یہ تجربہ اور معاینہ جتنا بھی مختلف فیہ ہو جائے، بہرحال، زندہ وہی ہے جسے لوگ زندہ سمجھیں اور مردہ وہی ہے جو ان کے ہاں مردہ قرار پائے۔

دوسرے یہ کہ انسان دنیا میں جیتا ہے اور کچھ وقت گزار کر موت سے جا ملتا ہے، یہ بات جس طرح ہر شک سے بالاتر ہے، اسی طرح اسے حقیقت ماننے والے لوگ صرف وہی نہیں جو کسی نہ کسی درجے میں مذہب سے متعلق ہیں۔ کوئی مذہب پسند ہے یا مذہب بے زار، ہر کوئی اس کی ایسے ہی تصدیق کرتا ہے جیسے چمکتے سورج کا مشاہدہ کرنے والے باہم مختلف لوگ، بلاتفریق، اس کے روشن ہونے کی تصدیق کرتے ہیں۔

لیکن موت کو طے شدہ امر مان لینے کے بعد معاملہ اس وقت نزاع کا شکار ہو جاتا ہے، جب بات طبیعات سے اٹھ کر مافوق چلی جاتی ہے۔ یہاں دو قسم کی آرا وجود میں آتی ہیں: بعض لوگوں کے خیال میں انسان مرتا ہے اور قصہ ختم ہو جاتا ہے، مگر بعض کے نزدیک یہ موت اصل میں ایک نئے دور کی ابتدا ہے کہ جس میں اسے پھر سے زندگی دی جانی ہے۔ موت کے بعد زندگی دیے جانے کا یہ دعویٰ، کم و بیش ہر مذہب کا متفقہ عقیدہ ہے۔ قرآن کریم میں بھی دُنیوی زندگی اور موت کا ذکر کرنے کے بعد اسے یوں بیان کیا گیا ہے:

ثُمَّ اِنَّكُمۡ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ تُبۡعَثُوۡنَ. ''(مرنے کے بعد) پھر تم قیامت کے روز ضرور اٹھائے جاؤ گے۔'' (المومنون ۲۳: ۱۶)

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

یہ وہ مقام ہے جہاں لامذہبیت مذہب سے جدا ہو جاتی اور بعد از موت زندگی کا شدت سے ردّ کرتی ہے۔ تاہم اس کا اس عقیدے کو ردّ کرنا، خواب وخیال سمجھنا یا پھر اسے ذہنی افیون قرار دے ڈالنا، یہ سب سمجھ میں آنے والی باتیں ہیں۔ اس لیے کہ لامذہبیت جس علم پر سو فی صد اعتماد کرتی ہے، وہ علم اپنی تمام وسعتوں کے باوجود، محض حواس کا پروردہ اور قیاس کا لے پالک ہے۔ ان میں سے حواس کی حالت تو یہ ہے کہ وہ اس بات کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے کہ مادے سے ماورا کسی شے کا احاطہ کر سکیں اور نہ عقل اتنی پرواز رکھتی ہے کہ ان سے حاصل ہوئے علم سے اوپر اٹھ کر کسی شے کا تصور کر سکے۔ چنانچہ صرف تجربوں اور اندازوں کو علم سمجھنے والوں سے یہ توقع ہرگز نہیں ہونی چاہیے کہ وہ موت کے بعد زندگی کو تسلیم کر لیں گے کہ یہ کسی اندھے سے دیکھنے اور کسی لنگڑے سے بھاگنے کی امید باندھ لینے والی بات ہوگی۔ تاہم، عقل کے پجاریوں اور حواس خمسہ کے ان قیدیوں کو کم سے کم یہ ضرور چاہیے کہ وہ انکار اور ناواقفیت کے درمیان میں حد فاصل قائم رکھیں۔ اس لیے کہ جس شے کا علم نہ ہو، اس کے وجود ہی سے ہم منکر ہو جائیں، یہ کوئی علمی رویہ نہیں۔ ماضی قریب میں بہت سی مادی چیزیں ایسی تھیں جن کے بارے ہم قطعی طور پر ناواقف تھے، حالاں کہ وہ ایک حقیقت تھیں اور باقاعدہ طور پر اپنا وجود رکھتی تھیں، ہاں، اپنی رونمائی میں جہل کے پردے سرک جانے اور لاعلمی کے اندھیرے چھٹ جانے کی وہ منتظر ضرور تھیں۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

بہرکیف، مرنے کے بعد زندگی ہر مذہب کا بنیادی موضوع ہے اور اس کے پاس اسے ثابت کرنے کے لیے دلائل کی بھی ایک دنیا ہے۔ اس لیے کہ دین صرف محسوسات کو ماننے کا نام نہیں، یہ ان سے ماورا حقائق کو عقل اور فکر کے ذریعے سے سمجھنے اور انھیں مان لینے کا بھی داعی ہے۔ نیز ضروری نہیں کہ دلیل وہی ہوتی ہو جسے حِس، مشاہدے اور تجربے کی بنیاد حاصل ہو یا جسے کھلی آنکھوں سے دیکھا جا سکتا اور مَعمل میں آزمایا جا سکتا ہو، بلکہ ہر وہ بات دلیل ہو سکتی ہے جو معلوم سے غیر معلوم تک اور محسوس سے غیر محسوس تک لے جا سکتی ہو۔ مذہب کا دامن اس طرح کے دلائل سے بھرا ہوا ہے اور بعد از موت زندگی کو ثابت کرنے کے لیے وہ ان سے ہٹ کر کسی اور دلیل کا بالکل بھی محتاج نہیں۔ چنانچہ اس مقام پر مذہب اپنا مقدمہ الگ سے قائم کرتا ہے اور اس کی تائید میں بہت سے عقلی اور فطری دلائل بھی مہیا کرتا ہے۔

مذہبی دنیا اس عقیدے پر یقین کیوں رکھتی ہے، اس کے وجوہ بھی نہایت معقول ہیں:

مذہب ان تعلیمات کا داعی ہوتا ہے جو اعلیٰ اقدار یا بنیادی اخلاقیات سے پھوٹتی، منہ زور خواہشات کو لگام دیتی اور اس مقصد کے لیے جان ومال کی قربانی کا تقاضا کرتی ہیں، چنانچہ ان پر عمل کی تحریک پیدا کرنے کے لیے مذہب

کے پاس سب سے بڑا محرک یہی ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کے سامنے ایک نئی زندگی کا اثبات کرے۔

دوسرے یہ کہ مذہبی احکام ماننے کی صورت میں مذہب کے پیرووں کو جو نقصان جانب نفس اٹھانا پڑتا ہے، اس کی تلافی کی واحد صورت بھی یہی ہے کہ انھیں نئی زندگی کی نوید دی جائے۔ اُس زندگی کی نوید کہ جو اِن کی قربانیوں کا حاصل، ان کی ریاضتوں کا ثمرہ اوران کی تمام عزیمتوں کا صلہ ٹھیرے۔ سواسی طرح کے دیگر وجوہ ہیں کہ تاریخ عالم کے ہر اہم مذہب میں، وہ عالمی ہو یا علاقائی، مرنے کے بعد زندگی کا عقیدہ بنیادی حیثیت کا حامل رہا ہے۔

دنیاے مذہب میں حیات بعد از موت کو بنیادی نظریہ تسلیم کر لینے کے بعد اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ نظریہ کیا ہر مذہب میں ایک جیسی اساسات اور تفصیلات رکھتا ہے یا پھر دوسرے نظریات کی طرح اختلاف و انتشار کا شکار اور رطب و یابس کا ایک مجموعہ بن کر رہ گیا ہے؟ آج کے معروف اور زندہ ادیان کا اگر مطالعہ کیا جائے تو اس سوال کا جواب نہایت مایوس کن ملتا ہے اور ادیان کا باہمی اختلاف اس میں بھی اپنا رنگ جماتا دکھائی دیتا ہے۔ اس کے بارے میں ایسی پُر پیچ اور اُلجھی ہوئی تعلیمات ملتی ہیں کہ کسی طالب حق کے لیے گوہر مراد کو پالینا ایسے ہی ہے جیسے گھاس کے ایک بڑے ڈھیر میں سے کوئی باریک سوئی ڈھونڈ نکالنا۔ لیکن اختلاف کی ان بھول بھلیاں سے دامن بچاتے اور فروعی چیزوں سے صرف نظر کرتے ہوئے اگر ہم اصولی طور پر دیکھیں تو اس مسئلے میں بناے اختلاف صرف ایک سوال ہے، وہ یہ کہ موت کے بعد انسان کی روح کے ساتھ کیا معاملہ ہوتا اور اس پر کیا کیا احوال گزرتے ہیں؟

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

اس سوال کے جواب میں بعض لوگوں کا خیال ہے کہ روح انسانی جسم سے علیحدہ ہو کر خدا میں ضم ہو جاتی ہے اور بعض کے نزدیک ایسا نہیں ہے۔ پھر جن کے ہاں ایسا نہیں ہے، ان میں سے بعض کی راے ہے کہ جسم سے الگ ہو جانے کے بعد وہ پھر کسی مادی جسم میں لوٹا دی جاتی ہے اور بعض کا کہنا ہے کہ اسے جسم تو ضرور ملے گا، مگر ابھی اور اس دنیا میں نہیں، بلکہ یہ سب کچھ ایک نئی دنیا میں واقع ہوگا۔ موضوع کی اس تقسیم کو اگر مان لیا جائے تو اس ساری بحث کو ہم تین بنیادی عنوانات کے تحت پڑھ سکتے ہیں:

وصال، تناسخ اور اِحیا۔

ان تینوں میں سے وصال کو اس لیے خارج از بحث کیا جا سکتا ہے کہ اس کی حیثیت ایک مستقل نظریے کی نہیں، بلکہ ایک ضمنی اور جزوی، فکری انحراف کی سی ہے۔ یہ عقیدہ جہاں بھی پایا جاتا ہے، طفیلی صورت ہی میں پایا جاتا ہے اور اس لحاظ سے یہ تناسخ کا عقیدہ رکھنے والوں کے ہاں بھی ملتا ہے اور احیا کو ماننے والوں کے ہاں بھی۔ دوسرے

یہ کہ اس کے مطابق موت کے بعد روح اپنا جسد خاکی چھوڑ کر کسی اور سے نہیں، خود اپنے خالق سے جا ملتی ہے۔ اور اس کی دلیل ان کے پاس اگر کوئی ہے تو وہ صرف یہ کہ انسان کی روح خدا ہی کا ایک جز یا اس کا عکس ہے کہ جسے کچھ وقت کے لیے دنیا میں بھیجا گیا تھا، اس لیے ضروری ہے کہ جسم سے آزاد ہونے کے بعد یہ پھر اپنی اصل کی طرف لوٹ جائے۔ گویا اہل وصال کے نزدیک دنیا میں اصلاً کچھ بھی نہیں، صرف خدا ہے اور اسی کے ایک لازمی نتیجے کے طور پر، یہاں جو کچھ بھی ہے، وہ سب خدا ہے۔ اب مذہب جو کہ عابد اور معبود کی تقسیم کو مانتا اور اس بنیاد پر اطاعت کا حکم دیتا ہے، اسے کس طرح تسلیم کر سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ مان لینے کے بعد تو مذہب کی بنیاد ڈھے جاتی اور یہ اپنے وجود کی علت ہی کھو بیٹھتا ہے۔ لہٰذا، وصال کا اس قدر نامعقول ہونا، یہ بھی ایک وجہ ہے کہ ہم اس کی تفصیل سے صرف نظر کریں گے اور اپنی بحث کو صرف دو عنوانات تک محدود رکھیں گے، اور وہ یہ ہیں:

تناسخ اور اِحیا۔

[باقی]

---

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

سراج الدین محمد بہادر شاہ ظفر

آدمی کی نیکی باقی رہتی ہے

۱۔ دُنیا میں اپنے آپ کو جو کھینچتے ہیں دور
دیکھا تو صاف فہم میں کچھ اُن کے ہے قصور
ورنہ جو باصفا ہیں، خرد مند و ذی شعور
کیا دخل اُن کو آئے کبھی نخوت و غُرور
رکھتے غُبارِ کینہ سے وہ سینہ صاف ہیں
ہر نیک و بد سے صورتِ آئینہ صاف ہیں

☆

۲۔ کیا کیا جہاں میں ہو چکے شاہانِ ذی کرم
کِس کِس طرح سے رکھتے تھے ساتھ اپنے وہ حشم
آخر گئے جہان سے تنہا سوئے عدم
دارا کہاں، کہاں ہے سکندر، کہاں ہے جم
کوئی نہ یاں رہا ہے نہ کوئی یہاں رہے
کُچھ اے ظؔفر رہے تو نِکوئی یہاں رہے

(سفینۂ اردو، مرتب: مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی ۱۲۵-۱۲۶)

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com